بہار کی بہار

(جلد دوم)

مصنف

اعجاز علی ارشد

بہار کی بہار

(جلد دوم)

مصنف
اعجاز علی ارشد

بہار کی بہار

(جلد دوم)

مصنف

اعجاز علی ارشد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	-/150 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1942

Bihar Ki Bahar (Vol-II)

By: Aijaz Ali Arshad

ISBN :978-93-5160-183-8

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسارا پرنٹنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

	حرف آغاز	xi
	مقدمہ جلد اول	xv
1	احسن رضوی	1
2	اصغر امام فلسفی	4
3	افضل عظیم آبادی	6
4	اطہر شیر	9
5	اکرام شبنم	11
6	اقبال حسین	14
7	اعجاز شاہین	16
8	ارتضیٰ کریم	18
9	ابوالکلام عزیزی	21
10	احسان اشرف	23

11	اسلم آزاد	25
12	اسرائیل رضا	28
13	اسلام عشرت	30
14	ایچے کمار بے باک	32
15	اثر فریدی	35
16	احمد بدر	37
17	اختر واصف	39
18	استاد پٹوی	41
19	اشرف جہاں	43
20	اشرف النبی قیصر	45
21	اظہار خضر	47
22	ایم۔ عظیم اللہ	49
23	اعجاز علی ارشد	51
24	امتیاز احمد	53
25	بلبیر سنگھ حسین	55
26	پرویز شاہدی	58
27	پیاسی عظیم آبادی	61
28	پریم کرن	64
29	پرویز انجم	67
30	تسنیم کوثر	69
31	ثاقب عظیم آبادی	71
32	جمیلہ خدا بخش	73
33	جوہر نظامی	75
34	جابر حسین	77

35	جاوید حیات	80
36	جنون اشرفی	82
37	حامد عظیم آبادی	84
38	حامد علی خاں	87
39	خواجہ افضل امام	89
40	خورشید اکبر	91
41	خالد عبادی	94
42	ذکی الحق	96
43	رامیشور پرساد گلوارا	98
44	رضوان احمد	100
45	ریاض عظیم آبادی	102
46	رحمٰن شاہی	104
47	ریحان غنی	107
48	راشد احمد	110
49	سید شاہد اقبال	112
50	سلطان آزاد	114
51	سید حسین احمد	116
52	شین مظفر پوری	118
53	شبیر احمد	121
54	شوئل احمد	123
55	شمیم فاروقی	126
56	شان الرحمٰن	128
57	شوکت حیات	130
58	شمیم قاسمی	132

59	شہاب ظفر اعظمی	135
60	صبیح الحق عمادی	137
61	صابر آروی	139
62	صفدر امام قادری	141
63	طلحہ رضوی برق	143
64	ظفر اوگانوی	147
65	ظفر صدیقی	149
66	عبدالمجید شمس	151
67	عظیم الدین مخمور	153
68	علیم اللہ حالی	156
69	عبدالخالق	158
70	عبدالصمد	160
71	عبید قمر	164
72	علی امام	167
73	عالم خورشید	169
74	عطا عابدی	172
75	فخرالدین عارفی	175
76	قتیل دانا پوری	178
77	قیوم خضر	181
78	قاسم خورشید	184
79	کلیم الرحمٰن کاکوی	187
80	لاڈلے صاحب بیتاب	189
81	محمود علی خاں صبا	192
82	مسلم عظیم آبادی	195

83	محمودہ خاتون	198
84	مختارالدین آرزو	200
85	معصوم شرقی اسیر	202
86	مشتاق احمد نوری	204
87	منیر سیفی	206
88	مظفر اعجاز	208
89	محمد ذاکر حسین	210
90	محمد مظاہر الحق	212
91	محمد کوثر اعظم	214
92	نسیم مظفر پوری	216
93	ولی کاکوی	218
94	واقف عظیم آبادی	220
95	واحد نظیر	223

یہ چاند تارے بھی ہیں ہمارے

96	یگانہ چنگیزی	227
97	مناظر احسن گیلانی	231
98	سید سلیمان ندوی	234
99	انور عظیم	236
100	رشیدۃ النسا	239

حرفِ آغاز

اللہ کا شکر ہے کہ ''بہار کی بہار'' کا پہلا حصہ بے حد مقبول ہوا اور اب یہ دوسرا حصہ بھی تکمیل کے مرحلوں سے گذر کر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ بیسویں صدی کے عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے جو ادیب و شاعر کسی سبب سے پہلی جلد میں جگہ نہیں پا سکے تھے ان کا تذکرہ یہاں موجود ہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تقسیم ہند کے بعد پیدا ہوئے یا 47 کے بعد ادبی افق پر نمایاں ہوئے۔ مگر ایسے بزرگوں کی تعداد بھی خاصی ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ہی اپنی پہچان بنا چکے تھے۔

مجھے احساس ہے کہ یہ کام اس خواب کی سو فی صد تعبیر نہیں جو میں نے کم و بیش سات برس پہلے دیکھا تھا۔ مگر روایتی انداز میں راہ طلب کی دشواریوں کا شکوہ کرنا مجھے پسند نہیں۔ اس لیے بس اتنا اعتراف کر لینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے جب اس کام کا آغاز کیا تھا تو مجھے اس کی دشواریوں کا اندازہ نہ تھا۔ سوانحی حالات کی فراہمی بظاہر بے حد آسان معلوم ہوتی ہے لیکن بعض اوقات سامنے کے احوال و سنین میں بھی بری طرح اختلاف رائے ہو جاتا ہے اور کسی واضح نتیجے تک پہنچنے کی سبیل نظر نہیں آتی۔ ایک سامنے کی مثال حال کے دنوں میں پیش آنے والا یہ واقعہ ہے کہ پروفیسر وہاب اشرفی کے انتقال کی جو خبر اردو رسالوں میں شائع ہوئی اس میں ہر جگہ ان کے وارثین میں چار بیٹوں کے ساتھ دو بیٹیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس دوران اس بات کی تردید بھی کی گئی لیکن ایک سے دوسرے اور دوسرے سے

تیسرے رسالے میں ان کے سوانحی حالات کے سلسلے میں یہ غلطی دہرائی جاتی رہی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ضرورتاً کتاب اور مقالہ لکھنے والے تو خیر تن آسانی سے کام لیتے ہی ہیں مگر خود متعلقہ فنکاروں یا ان کے ورثاء کا رویہ حیرت انگیز ہوتا ہے۔ کسی کا نام چھوٹ جائے، کسی کے بارے میں کوئی اہم بات درج نہ ہو سکے یا غلط درج ہو جائے تو شکوہ و شکایت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن پیہم درخواستوں کے باوجود معلومات فراہم کرنے کے لیے دست تعاون بہت کم سامنے آتا ہے۔ دوسری طرف غیر اہم ادبی شخصیتوں کو کتاب میں جگہ دلانے کی تدبیریں بھی جاری رہتی ہیں۔ ادبی تاریخ لکھنے والوں کو ان تمام دشواریوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور کہیں کہیں مفاہمت کی راہ بھی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ بہر حال، یہاں ان امور کا تذکرہ لاحاصل ہے چونکہ ان سے نہ میرا کچھ بھلا ہونا ہے نہ قارئین کا۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ ناموں کے انتخاب کے لیے پہلی جلد میں جو رہنما اصول میں نے مرتب کیے تھے ان سے زیادہ انحراف کی نوبت نہیں آئی۔ میرے ذہن میں جو فہرست مرتب شدہ تھی اس میں سے دس بیس فی صد نام ضرور چھوٹ گئے، چونکہ اکثر لوگوں کے حسب ضرورت سوانحی حالات نہیں ملے، کچھ کی تصویر نہیں حاصل ہو سکی اور بعض کی تصنیفات دستیاب نہیں تھیں۔ کتاب کی اشاعت میں مزید تاخیر مناسب نہ تھی، اس لیے بہتر یہی معلوم ہوا کہ فی الحال دوسری جلد شائع کر دی جائے اور معلومات کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہے تاکہ کبھی تیسری جلد کی اشاعت کا موقع آئے تو زیادہ دشواری نہ ہو۔ اس طرح بیسویں صدی کے عظیم آباد کی ادبی تاریخ موجودہ شکل میں بڑی حد تک مکمل ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق ریاست بہار کے دوسرے ادبی مراکز کی تاریخ بھی زیر تصنیف ہے اور کچھ لوگ بڑی تندہی کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی مجموعی تعداد ہزاروں میں ہوگی مگر فی الحال یہ بات اپنے آپ میں اہم ہے کہ صرف ایک شہر اور اس کے گرد و نواح میں دو سو سے زیادہ ادبی شخصیات اس ایک صدی میں سرگرم کار رہیں جس پر یہ الزام ہے کہ ع

یہ صدی دشمن ارباب ہنر لگتی ہے

دبستان عظیم آباد کی تشکیل و تعمیر سے متعلق کئی نکات پہلی جلد میں پیش کر چکا ہوں۔ یہاں ان باتوں کو دہرانے کا کوئی محل نہیں مگر چند اور وضاحتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ دبستانوں کی علاقائی تقسیم اب اختتام کی طرف جا رہی ہے۔ اس لیے دوسری ریاستوں کی طرح

صوبۂ بہار میں بھی مختلف اسالیب یا طرز فکر کی نمائندگی کرنے والے فنکار اپنی جگہ بنا رہے ہیں مگر نثر نگاروں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد جس طرح آج بھی یہاں فعال ہے اس کو اردو زبان وادب کے لیے فالِ نیک تصور کرتے ہوئے عظیم آباد کو ایک بڑا ادبی مرکز مان لینا ناگزیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلوب کی سطح پر بہر حال اس ادبی مرکز کی کچھ نہ کچھ انفرادیت رہی ہے اور اس لب و لہجے کو غیر نکسالی یا غیر معیاری کہہ کر نظر انداز کر دینے کی جگہ اردو کے مروجہ اسالیب کا حصہ بنا لینے میں ہی زبان وادب کی بھلائی ہے چونکہ بلاشبہ زبانیں Exclusion اور Elimination سے نہیں Inclusion سے ہی توانا اور ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ دبستان عظیم آباد میں شگفتگی اور سنجیدگی کی جو آمیزش کل تھی وہ آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ پھکڑ پن، حد سے بڑھی ہوئی شوخی اور سطحیت سے اس کا رشتہ کل بھی بہت کم تھا اور آج بھی نہیں ہے۔

دو تین باتیں اس کتاب کے حوالے سے بھی عرض کرنی ہیں۔ اول تو یہ کہ عام طور سے ان ہی ادبی شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کی بیسویں صدی میں یا تو کوئی تصنیف وتالیف منظر عام پر آئی ہے یا جو تواتر کے ساتھ رسائل واخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض افراد کا تذکرہ مجبوراً چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ''تلامذۂ شاد'' کے نام سے سید نعمت اللہ کی جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں ایک سو سے زیادہ شاگردان شاد کا تذکرہ (کچھ لوگوں کا چند سطری اور بعض کا تفصیلی) موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق وتذکرہ میں جب کوئی اضافہ ممکن نہیں تو اس کی نقل بے معنی ٹھہری۔ اس لیے چند مشاہیر کا انتخاب کافی سمجھا گیا ہے۔ دبستانوں کا دبستان (کراچی) کی صرف دو جلدوں میں آدھے درجن سے زائد شعرا مثلاً جمیل عظیم آبادی، مسلم شمیم، وفا براہی، پاشا رحمٰن وغیرہ ایسے ہیں جن کا تذکرہ ہو سکتا تھا مگر یہاں بھی وہی مرحلہ سامنے آیا۔ دوسری طرف بی بی رشیدہ جو کہ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں، ان کا تذکرہ صرف اس لیے شامل کیا گیا کہ وہ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں تک فعال رہیں گرچہ ان کا ناول ''اصلاح النسا'' 1881 میں ہی لکھا گیا تھا اور اب تک کی اطلاع کے مطابق بیسویں صدی میں ان کی کوئی ادبی کاوش سامنے نہیں آئی ہے۔ ان دونوں سے اہم ترین بات یہ ہے کہ 'یہ چاند تارے بھی ہیں ہمارے' کے زیر عنوان کتاب کے آخر میں بہ وجوہ چند ایسی شخصیات کے بارے میں لکھا گیا ہے جن کی جائے پیدائش بھی بہار ہی ہے۔ اسے پیش

نظر کتاب کی جلد اول میں وضع کردہ رہنما اصولوں سے قدرے انحراف کہہ سکتے ہیں اور یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آخر ان کے انتخاب کی وجوہات کیا رہی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہر شخص کی شمولیت کے اسباب دوسروں سے مختلف ہیں۔ مثلاً یگانہ کے بارے میں تو اکثر لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ وہ آخر تک خود کو ''ثم عظیم آبادی'' لکھتے رہے۔ اب مولانا مناظر احسن گیلانی کی طرف رخ کیجیے تو ان کے بارے میں یہ مشہور رہا ہے کہ انہوں نے عمر بھر کوئی تصویر نہیں کھنچوائی اور ممکن ہے سفر حج کے لیے کوئی تصویر اتروائی بھی ہو تو اسے تلف کر دیا۔ ان سے متعلق کتابوں میں یا انٹرنیٹ پر بھی خاصی معلومات مل جاتی ہیں مگر کوئی تصویر نہیں ملتی۔ میں نے اس سلسلے میں گیلانی کا سفر بھی اختیار کیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ ایسے میں ان کے عزیز جمال احمد گیلانی کے وسیلے سے حاصل شدہ ان کی ایک نادر تصویر کو میں نے مختصر سوانحی حالات کے ساتھ محفوظ کر دینا مناسب سمجھا۔ میں دیگر ناموں کے سلسلے میں فرداً فرداً وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا۔ اتنا ضرور اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ایسی شخصیات ہیں جن کی وابستگی کسی بھی ادبی مرکز کے لیے قابل فخر ہو سکتی ہے۔ یہ فخر دانبساط دبستان عظیم آباد کے حصے میں آجائے تو برا کیا ہے؟ ویسے بھی کتاب میں ان کی شمولیت کے لیے یہ جواز کچھ کم نہیں کہ یہ تمام لوگ عظیم آباد سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

امید ہے کہ قارئین حسب روایت اپنے تاثرات سے نوازیں گے اور ممکن ہو تو اپنے اپنے علاقوں کے کم از کم ایسے لوگوں کی نشاندہی بھی کریں گے جو اپنی کسی نہ کسی انفرادیت کے سبب تاریخ ادب اردو کا حصہ بننے کے مستحق تھے یا ہیں مگر ان پر عام طور سے نظر نہیں جاتی۔ آپ کا دست کرم اٹھے یا نہیں مگر ہمارا 'حرف طلب' ایک سوالیہ نشان کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کتاب کی پہلی جلد خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی تھی جس کا مقدمہ میں نے من وعن یہاں شریک اشاعت کر دیا ہے تاکہ تسلسل برقرار رہے۔

اعجاز علی ارشد
شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی

مقدمہ

(جلد اول)

یہ مختصر سی کتاب دراصل ایک طویل ادبی منصوبے کا حصہ ہے جس پر میں گذشتہ کئی برسوں سے کام کر رہا ہوں۔ اپنے محدود مطالعے کے دوران مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ گرچہ بہار کے بعض علاقوں کی اہم ادبی شخصیات سے متعلق معلوماتی کتابیں وقفے وقفے سے منظر عام پر آتی رہی ہیں مگر بہار کے اردو شعر و ادب کی ایک مربوط اور مبسوط ادبی تاریخ لکھنے کی ضرورت باقی ہے۔ کبھی کبھی میں ''دکن میں اردو'' کی ضخامت کو دیکھتا یا کسی ضرورت سے ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار'' وغیرہ کی ورق گردانی کرتا تو ایک احساس نارسائی مجھ پہ حاوی ہو جاتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ میرا صرف ارادہ نہیں رہا خواب بن گیا کہ بہار کی ایک مبسوط ادبی تاریخ ''بہار میں اردو'' یا ''دبستان بہار'' کے نام سے لکھی جائے جس کا مزاج تنقیدی کم اور سوانحی یا تحقیقی زیادہ ہو۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ کام نہ تو آسان ہے اور نہ کسی تنہا شخص کے بس کا ہے۔ اس کے باوجود میں ایک عرصے تک تھوڑا تھوڑا مواد جمع کرتا رہا۔ اور پھر ایک ہی دن میں دو ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے میرے شوق اور حوصلہ کو ایک نئی توانائی دیتے ہوئے ''منزل ما دور نیست'' کا سبق دیا۔ اگست 2006 کی ایک دوپہر کو خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر اور میرے کرم فرما ڈاکٹر امتیاز احمد کے دفتر میں احمد حسین صدیقی کی ایک کتاب ''دبستانوں کا

دبستان کراچی'' پر میری نظر پڑی اور میں نہایت اشتیاق کے ساتھ اس کے صفحات الٹ پلٹ رہا تھا کہ موصوف کا یہ حسن طلب بھی میرے سامنے آ گیا... 'کیا یہ ممکن نہیں کہ اس طرح کی ایک کتاب بہار سے متعلق لکھ دی جائے؟'

یہ جملہ گویا میری غفلت کے لیے ایک تازیانہ اور اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا ایک بہانہ تھا۔ میں نے وہ کتاب چند دنوں کے لیے ان سے مانگ لی اور ان چند دنوں کے اندر ہی انھیں اپنے اس پراجکٹ کی اطلاع کر دی جس کے تحت بہار کے مختلف علاقوں کی ادبی تاریخ (ابتدائی مرحلے میں صرف بیسویں صدی کے حوالے سے) لکھنے کا ارادہ تھا۔ موصوف نے ازراہ عنایت اس کی اشاعت کے لیے اپنی متعلقہ کمیٹی سے منظوری لے کر مجھے خبر کر دی اور میں نے قدرے تیزی سے کام شروع کر دیا۔ ذہن میں تھا کہ سال چھ مہینے میں کم از کم عظیم آباد کی ادبی تاریخ مکمل ہو جائے گی۔ پھر دوسرے ادبی مراکز کی طرف رجوع کروں گا۔ مگر جیسے جیسے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے، راہ طلب کی دشواریوں کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ شاید میں اس کام سے کنارہ کش بھی ہو جاتا مگر ایک تو 'راہ سے واپس چلا جانا مری فطرت نہیں' کا معاملہ اور دوسرے امتیاز صاحب کی حوصلہ افزائی، یہ کام جاری رہا۔ ابتدائی فہرست میں (عظیم آباد کی حد تک) صرف ایک سو پچاس نام تھے جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے ڈھائی سو تک پہنچ گئی۔ مزید ناموں کے اضافے کی امید قوی تھی۔ سبھوں کے مستند سوانحی حالات کی فراہمی دشوار اور تصویروں کا حصول دشوار تر ثابت ہو رہا تھا۔ پھر یہ نکتہ بھی پیش نظر تھا کہ معاصرین پہ لکھنا بے حد دشوار اور پیچیدہ کام ہے۔ اس طرح کے تذکروں کی تصنیف میں ''نیکی برباد گناہ لازم'' کے مصداق اعتراضات اور شکوہ وشکایت کے امکانات بھی بہت ہوتے ہیں، یعنی فلاں کا ذکر کیوں ہوا اور فلاں کا چھوٹ گیا یا جان بوجھ کر چھوڑا گیا۔ اس لیے قلم اٹھاتے ہی سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ خود اپنے ہی گرد ایک ''لکشمن ریکھا'' کھینچ کر خود کو اسی دائرہ میں محدود رکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو معروضی انداز اختیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات بنیادی اصولوں کی شکل میں سامنے آئے:

(الف) اس کتاب میں بنیادی طور پر ان ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ ہوگا جو بیسویں صدی کے عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔

(ب) ایسے ادیب وشاعر بھی اس کا حصہ ہوں گے جو بیسویں صدی یا پٹنہ میں تو نہیں پیدا ہوئے مگر گذشتہ صدی میں کم از کم بیس برسوں تک یہاں فعال رہے۔

(ج) مرحومین سے قطع نظر ایسے ادیب وشاعر جن کی عمر تذکرے کی ترتیب کے وقت ساٹھ سال سے زیادہ ہوگی اور جنھوں نے گذشتہ دس برسوں کے دوران قابل ذکر ادبی کام کیا ہوگا، ان کا کتاب کی جلد اول میں تذکرہ ہوگا۔ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے قلم کاروں کا تذکرہ دوسری جلد میں کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ان رہنما اصولوں کے باوجود کچھ اہم ادبی شخصیتوں کے چھوٹ جانے اور غیر ضروری ناموں کے شریک ہو جانے کا احتمال باقی رہتا ہے۔ اس لیے میں نے پہلے تو یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا کہ یہ کوئی ''لاٹ صاحب'' کی ڈنر پارٹی تو ہے نہیں جہاں مدعوئین کی تعداد بھی طے ہو اور ہر کرسی کے سامنے ایک نیم پلیٹ بھی لگی ہو۔ یہ تو ایک ایسی بزم ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت باعث مسرت ہوتی ہے۔ پھر میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اگر کوئی قابل ذکر ادبی شخصیت معلومات کی عدم دستیابی یا دوسرے اسباب کی بنا پر چھوٹ جائے تو اسے دوسری جلد میں جگہ دینے کی پوری کوشش کی جائے اور اس طرح بیسوی صدی کے حوالے سے عظیم آباد کی ایک بھرپور ادبی تاریخ مرتب ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ معلومات کی کمی کے سبب بعض ایسے نام بھی پہلی جلد میں جگہ نہ پا سکے جن کا تذکرہ ضروری تھا مگر کتاب کی اشاعت میں مزید تاخیر مناسب نہ تھی۔ اس لیے آئندہ جلد کے متوقع مشتملات کی ایک فہرست کتاب کے آخر میں درج کر دی گئی ہے جس میں اہل نظر کے مشوروں سے اضافہ کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ جہاں تک آگے کی جلدوں کا سوال ہے اس سلسلے میں پٹنہ کے علاوہ گیا، آرہ، بہار شریف، دربھنگہ، مظفر پور، سیوان، کٹیہار، پورنیہ، موتی ہاری، بتیا، بھاگلپور اور دوسرے ادبی مراکز کے اہل قلم کا عملی تعاون بے حد ضروری ہے ورنہ کسی بھی فرد واحد کے لیے علم وادب کے ان تمام خزانوں تک رسائی ممکن نہیں جو بہار کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔

بہر حال اپنی موجودہ شکل میں اس کتاب کو بہار کی مجوزہ ادبی تاریخ کا نقطۂ آغاز سمجھا

جاسکتا ہے۔اس کام کا آغاز پٹنہ سے کرنے کا مقصد بس یہ ہے کہ سوانحی لغت کا ایک ماڈل مرتب ہو سکے اور اسی نہج پر دوسرے شہروں کی سوانحی لغت مرتب کرنے کے بعد بہار میں اردو زبان وادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھنے کی راہ ہموار ہو جائے۔اسی نقطۂ نظر کے تحت میں نے چند صفحات میں ''دبستان عظیم آباد'' کی حدود اور امتیازی خصوصیات متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ''بہار میں اردو'' کا یہ پراجکٹ (اگر مکمل ہو سکا) انشاءاللہ آٹھ یا دس جلدوں میں ہوگا اور اپنی تکمیل شدہ شکل میں کچھ اس نوعیت کا ہوگا۔

جلد اول و دوم: بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے عظیم آباد کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ

جلد سوم تا دہم: بہار کے دیگر ادبی مراکز کے شعرا و ادبا کا تذکرہ

مجھے پتہ نہیں کہ میری یہ کاوش کس حد تک مفید ثابت ہوگی مگر اس کی تیاری کے دوران مشہور محقق اور دانشور جناب مشفق خواجہ کی جو سطور میرے پیش نظر رہی ہیں انھیں میں یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:

''اردو میں کتب حوالہ کی جو کمی ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جسے کسی موضوع پر تھوڑا بہت کام کرنے کا تجربہ ہے۔سب سے زیادہ کمی جس چیز کی کھٹکتی ہے، وہ سوانحی لغت ہے۔اگر آپ سیاست، مذہب، ادب یا فنون لطیفہ سے متعلق کسی جدید یا قدیم شخصیت کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں تو کوئی کتاب رہنمائی نہیں کرتی۔جب کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں نیشنل بایوگرافیکل ڈکشنریز تیار کی جاتی ہیں اور مناسب وقفوں سے ان میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔لیکن ہمارے ہاں اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی فرد کے ضروری کوائف جاننا چاہیں تو اس کے لیے آپ کو بے شمار مآخذ کی ورق گردانی کرنی ہوگی، اس کے باجود یقینی نہیں ہے کہ معلومات دستیاب ہو جائیں۔دیگر شعبوں سے قطع نظر، صرف اردو ادب ہی پر نظر ڈالی جائے تو صورت حال خاصی مایوس کن نظر آتی ہے۔یہ بات میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی بیسوی صدی کے اہم ادیبوں میں سے تھے۔مے خانۂ درد، دلّی کا آخری دیار، لال قلعے کی ایک جھلک اور مضامین فراق جیسی کتابوں

کے مصنف جو کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ چند شخصی نوعیت کے مضامین سے قطع نظر، ان کے حالات زندگی اور تصانیف کی مکمل فہرست کسی تذکرے یا تاریخ ادب میں نہیں ملے گی.....ادبی شخصیات کے حالات رسالوں، تذکروں اور مختلف نوعیت کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت ان کتابوں کی ہے جو شہروں اور صوبوں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔''

اس جلد کی تکمیل میں ویسے تو مختلف ادبی رسالوں اور کتابوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور ان کا جگہ بہ جگہ حوالہ بھی دیا ہے مگر خاص طور پر تاریخ ادب اردو از پروفیسر وہاب اشرفی، دبستان عظیم آباد از سلطان آزاد' 'وفیات مشاہیر بہار' از ڈاکٹر سید شاہد اقبال اور تذکرہ مسلم شعرائے بہار از سید احمد اللہ ندوی سے مجھے جو مدد ملی ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ ویسے جہاں جہاں کوئی اختلافی پہلو دکھائی دیا ہے وہاں کم از کم سال پیدائش اور وفات کے سلسلے میں اپنے طور پر کافی چھان بین کرنے کے بعد ہی میں نے کوئی رائے دی ہے۔ ناموں کی ترتیب پہلے مرحلے میں حروف تہجی کے اعتبار سے ہے مگر دوسرے مرحلے میں تقدیم وتاخیر کا زیادہ خیال کیے بغیر مرحومین کا نام پہلے رکھا گیا ہے۔ اس کام کے دوران جن بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی دعائیں اور معاونتیں شامل حال رہی ہیں ان میں پروفیسر وہاب اشرفی، جناب معین کوثر، برادر عزیز حسن احمد اور سید ناظم رضا کا بے حد ممنون ہوں۔ خدا ان کے ساتھ میرے خوشگوار تعلقات برقرار رکھے۔ کتاب کی دوسری جلدوں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے نیک مشوروں اور تعاون کی درخواست ہے۔

اعجاز علی ارشد

احسن رضوی

سید شاہ احسن رضوی (تاریخی نام خیرات احسن، بہ اعتبار ہجری اور قلمی نام احسن رضوی) ولد حکیم سید شاہ بدرالدین بدر مستند روایتوں کے اعتبار سے 15 دسمبر 1911 کو اپنے آبائی شہر داناپور کے محلہ شاہ ٹولی میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر محمد صدر عالم صدیقی نے ''بیسویں صدی کے چند شعرائے داناپور'' میں لکھا ہے کہ احسن کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق بزرگوں کی نگرانی میں گھر ہی پہ ہوئی مگر ان کے قریبی دوست محمود سروش (ممبئی) نے ان کے مجموعہ کلام ''مطلع حیات'' میں خاصی تفصیل سے موصوف کے حالات قلم بند کرتے ہوئے یہ اشارہ کیا ہے کہ انھیں کسی اسکول میں داخل کرایا گیا تھا جہاں سے ایک دن وہ گھر واپس جانے کے بجائے کلکتہ روانہ ہوگئے اور تلاش معاش میں رنگون، لاہور اور کراچی وغیرہ کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر 1937 کے آس پاس بمبئی پہنچے۔ یہاں بھی جدوجہد کرنی پڑی مگر فلموں میں گانے اور مکالمے لکھنے کے سبب نہ صرف ملک گیر شہرت پائی بلکہ معاشی طور پہ آسودہ حال رہے۔ اس دوران تقریباً پندرہ برسوں تک گھر والوں سے کوئی رابطہ نہ رہا لیکن جب ان کی شہرت ہوئی تو داناپور سے دوبارہ رشتہ استوار ہوگیا۔ 1945 میں ان کی شادی بی بی سلیمہ خاتون بنت ڈاکٹر سید محمد رفیع الدین، رئیس و زمیندار موضع ڈمراواں (ضلع نالندہ) کے ساتھ ہوئی مگر شادی کے کچھ ہی دنوں بعد آزادی ہند

سے قبل کے فسادات شروع ہو گئے اور احسن نے مستقل طور پہ بمبئی کی رہائش اختیار کر لی۔ اس دوران مختلف واقعات وحادثات کے نتیجے میں شیعی عقائد سے انھیں اور ان کی اہلیہ دونوں کو بے حد قربت ہو گئی اور بقیہ زندگی انھوں نے اسی انداز سے گذاری۔ بقول ڈاکٹر صدیقی ان کی چار اولادیں ہوئیں۔ بیٹوں کے نام سید یاور عباس رضوی اور سید مشہود احسن رضوی ہیں جو اپنے والد کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کے سچے وارث ہیں۔ 70 سال کی عمر میں احسن رضوی پر فالج کا حملہ ہوا جس سے تیمارداری کے باوجود جاں بر نہ ہو سکے اور جنوری 1983 میں راہی ملک عدم ہوئے۔

مختلف روایتوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ احسن رضوی کی ادبی زندگی کا آغاز چودہ پندرہ برس کی عمر میں شعر گوئی سے ہوا۔ محمود سروش کا خیال ہے کہ انھوں نے شاعری اپنی فطری صلاحیت اور افتادِ طبع کے سبب شروع کی اور اس سلسلے میں اپنے والد سے کوئی مدد نہیں لی، جیسا کہ ان کے چچازاد بھائی ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کا بیان ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شاعر کی حیثیت سے کافی مشہور ہو جانے اور اخبارات ورسائل میں شائع ہونے کے بعد انھوں نے صرف آرزو لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا اور وہ بھی چند برسوں تک۔ بہر حال، سچائی جو بھی ہو، 1960 کے آس پاس احسن رضوی اردو کے اہم رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے اور فلموں میں پیشہ ورانہ مشغولیات کے باوجود ان کے سلام، نوحے، قصائد اور مراثی اہل ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے تھے۔ بمبئی میں رہتے ہوئے انھوں نے سیکڑوں فلموں کے لیے مکالمے اور گانے لکھے جن میں ''مغلِ اعظم'' اور ''دھول کا پھول'' جیسی فلمیں بھی شامل تھیں۔ اس کے باوجود وہ ''رثائی شاعری'' اور غزل گوئی سے وابستہ رہے۔ اس کا ثبوت ان کی درج ذیل کتابیں ہیں:

1	جوشِ فرات	(پچیس سلام اور نوحوں کا مجموعہ)	مطبوعہ 1955
2	تسنیم وکوثر	(قصائد شہدائے کربلا)	مطبوعہ 1956
3	نشانِ منزل	(غزلیات ورباعیات)	مطبوعہ 1968
4	لہولہو	(سلام اور نوحے)	مطبوعہ 1978
5	مطلعِ حیات	(مراثی کا مجموعہ)	مطبوعہ 1978
6	پیاسوں کی یاد	(نوحوں کا مجموعہ)	سن اشاعت لامعلوم

1997 میں شاہ بلال رضوی نے احسن رضوی کی حیات اور ادبی خدمات سے متعلق ایک

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا میں جمع کیا تھا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ سید عاشور کاظمی نے اپنی کتاب ''اردو مرثیے کے شعرا اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'' میں ان کی رثائی شاعری کے حوالے سے لکھا تھا:

> ''مراثی میں حضرت علی کی منقبت کے مختلف انداز اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ مدح سرائی، یہ منقبت صرف عقیدہ کے سبب ہی نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ حضرت علیؑ کی زندگی احسن رضوی کا آئیڈیل تھی۔ تاریخ اور بین کو نظم کرنے میں احسن رضوی نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور تاریخی معاملات میں صحت اور بین میں خانوادۂ رسالت کی عصمت اور مظلومیت کا خیال رکھا ہے۔ یہی محاسن مرثیے کو جدید مرثیے کی صف میں جگہ دلاتے ہیں۔''

جہاں تک احسن رضوی کی غزل گوئی کا سوال ہے، ان کی قادرالکلامی، احساس کی شدت اور فکر وفن کی بالیدگی کا تذکرہ تو ہوا ہے مگر اپنے آبائی علاقے سے گہری وابستگی اور اس سے دوری کے سبب محرومی یا مایوسی کی جو فضا ان کے یہاں ملتی ہے اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی ہے۔ حالانکہ یہ احساس محرومی ان کی بیشتر غزلوں کے کسی نہ کسی شعر میں نمایاں ہوتا رہا ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

جادۂ شوق کوئی پھولوں کا بستر تو نہیں — چین کیا ڈھونڈتے ہو دشتِ طلب گھر تو نہیں

سرائے دہر میں آنکھیں کھلی ہیں در کی طرح — سفر میں نیند کب آتی ہے اپنے گھر کی طرح

گذار دی شب غم جلتی دوپہر کی طرح — کسی کی شام نہ ہوگی مری سحر کی طرح

سلگتی آگ کسی جا کہیں تھے کھلتے پھول — بھری بہار میں چھوڑا تھا آشیانے کو

تقدیر لے چلی سوئے غربت جو کھینچ کر — کچھ دور تک وطن کی ہوا ساتھ ہوگئی

اصغر امام فلسفی

اصغر امام (تخلص فلسفی) ابن حکیم مولانا عبدالرحمٰن کے اسلاف اتر پردیش سے ہجرت کر کے بہار آئے تھے۔ اصغر امام 26/ ستمبر 1902 (سلطان آزاد کے مطابق 1908) کو محلہ پیر ویس (پیر باعث لین) عالم گنج، پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کے زیادہ حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں مگر جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانی کے دنوں سے ہی وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنماؤں سے متاثر ہو کر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کی پاداش میں انھیں 1942 کے آس پاس جلا وطن بھی ہونا پڑا۔ مگر بالآخر سبھاش چندر بوس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے اور Anti Compromise Conference کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ آزادی ملنے کے بعد وہ کانگریس کی حمایت میں سرگرم کار رہے۔ انھوں نے پارٹی کے لیے مختلف کتابچے تیار کیے، نظمیں لکھیں اور عملی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ان تمام سرگرمیوں کا اثر ان کی شاعری پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر اختر اورینوی نے 1955 میں لکھا تھا:-

> ''وہ ایک عوامی کارکن ہیں۔ وہ فلاح عامہ کے لیے اپنے ڈھنگ سے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ادب، سیاست، معاشیات، حقوق شہریت، عمرانیات اور پس

ماندہ طبقوں کے حقوق کے مسئلوں سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی......نہایت مہذب آدمی ہیں، بہت ہی منجھے ہوئے، شستہ و رفتہ و سلیس، آپ میں انکسار بے حد پایا جاتا ہے۔قومی وملی احساس و ولولہ آپ کا خاص حصہ ہے آپ کی شخصیت کے محاسن آپ کے فن میں بھی موجود ہیں۔"

اصغر امام فلسفی کی وفات 16 / مارچ 1997 کو ہوئی۔میر شکار ٹولی قبرستان (پٹنہ) میں دفن ہوئے۔پسماندگان میں ایک بیٹے اکبر امام کے علاوہ تین بہنیں ہیں۔

فلسفی کی ادبی زندگی کا آغاز 1955 میں ہوا۔ پہلا مجموعہ کلام "گلزار فلسفی" کے نام سے 1955 میں شائع ہوا۔اس وقت تک فلسفیاسی وسماجی تحریکوں اور ادبی جلسوں کے وسیلے سے بہت مشہور ہو چکے تھے۔اس لیے ان کے مجموعۂ کلام کی ابتدا میں علامہ جمیل مظہری، اختر اورینوی، صدر الدین فضا شمسی اور سہیل عظیم آبادی جیسے مشاہیر کی آرا شریک اشاعت ہیں۔ یہ مجموعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ACC5481 کے تحت موجود ہے۔ یہ مجموعہ دوبارہ 1980 میں قدرے ترمیم و اضافہ کے ساتھ بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔دوسرا مجموعۂ کلام "افکار فلسفی" 1956 میں طبع ہوا۔فسادات کے موضوع پر لکھے گئے آپ کے ڈرامے "ایثار" اور "ہماری درگت" بھی طباعت کے مرحلہ سے گزر کر مقبول ہوئے۔آل انڈیا ریڈیو اور مختلف رسائل و جرائد کے وسیلے سے بھی آپ کے کلام منظر عام پر آتے رہے۔آپ کے بعض مضامین بھی مقامی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ اور آپ دوسرے اخبارات و رسائل کے علاوہ "نقیب" پھلواری شریف سے بھی وابستہ رہے۔ابتدا میں اپنے والد محترم (تخلص عارف) سے اصلاح لی۔بعد میں کچھ دنوں حیدر دہلوی اور زار عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ان کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا عکس شاعری میں جلوہ گر ہے۔بعض نظمیں Topical Issues پر لکھی گئی ہیں مگر شعریت سے خالی نہیں۔ویسے تو انھوں نے کم و بیش سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر وہ بنیادی طور پر نظم اور غزل کے ہی شاعر ہیں۔اس لیے ان کی غزلوں کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔

جرأت رہے دلوں میں وہی بانکپن رہے ۔۔۔ منصور کی ادا رہے دار و رسن رہے

فلسفی ہوں اور میں فخر عظیم آباد ہوں ۔۔۔ سرزمینِ شاد سے ہوں عاشقِ ناشاد ہوں

وقتِ رخصت دل کی بیتابی کا عالم دیکھیے ۔۔۔ راہ میں مڑ مڑ کے ان کو دیکھتا جاتا ہوں میں

چشم ساقی کی بدولت رہتے ہیں مخمور سے ۔۔۔ اپنی مستی ہے مبرّا بادۂ انگور سے

افضل عظیم آبادی

سید فضل علی خاں (تخلص افضل) ولد نواب سید محمد محسن خاں کا تذکرہ گلشن حیات ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار'' دفتر گم گشتہ (کلیم عاجز) شاد کے نورتن (محمود علی خاں صبا)، تلامذۂ شاد (سید نعمت اللہ)، کلیات شاد (کلیم الدین احمد) اور دبستان عظیم آباد (سلطان آزاد) میں شاد عظیم آبادی کے ایک اہم شاگرد کی حیثیت سے موجود ہے مگر نہ تو ان کے سوانحی حالات کی تفصیل ملتی ہے نہ کلام کا زیادہ نمونہ دستیاب ہے۔ مجھے خاصی تلاش و جستجو کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے پروفیسر مہدی علی کی ایک مختصر قلمی تحریر دستیاب ہوئی جس میں اس خانوادے کے حالات قدرے تفصیل سے درج ہیں۔ موصوف نے نمونہ کلام کے طور پر کچھ غزلوں اور متفرق اشعار کا بھی انتخاب کیا ہے۔ اسی تحریر کی بنیاد پر ابوالکلام رحمانی نے اپنی کتاب ''تذکرہ مشاہیر ادب (شیخ پورہ) مطبوعہ 2005 میں ایک مختصر سا مضمون افضل پہ لکھا ہے جو جناب ثمر مہدی (نبیرہ افضل) کے وسیلے سے مجھے حاصل ہوا۔ مذکورہ بالا تحریروں کی روشنی میں بہ آسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی سند کے اعتبار سے افضل کا سن پیدائش 1897 ہے نہ کہ 1898 جیسا کہ بعض مورخین لکھتے ہیں۔ دیگر سوانحی تفصیلات یہ ہیں کہ افضل کا سلسلہ نسب چھتیسویں پشت میں امام محمد تقی سے ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد 1278 میں ہندوستان آئے اور اجودھیا (فیض آباد) میں آباد ہوئے جہاں خاندان کے مورث اعلیٰ شاہ شمس الدین

فریادرس کا مزار اب تک زیارت گاہ عوام ہے۔ رسالہ معاصر (پٹنہ) کی جلد 10 میں شائع شدہ ایک مضمون میں اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ منجھن شہید کا تذکرہ موجود ہے جو اتر پردیش سے بہار تشریف لائے تھے۔ فضل علی خاں کا تعلق اسی خانوادے سے ہے جو مستقل طور پر سنگی دالان پٹنہ سیٹی میں بس گیا تھا۔

افضل کی ابتدائی تعلیم محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ بی۔ این۔ کالج پٹنہ سے اسی سال انٹر کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا جس سال سے پٹنہ یونیورسٹی پہلی بار علیحدہ شناخت کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ پھر بی۔ اے کرنے کے بعد وکالت کی ڈگری حاصل کی مگر نہ تو کہیں ملازمت کی نہ باضابطہ وکالت۔ فارغ البالی کا زمانہ تھا اور زمینداری سے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اس لیے سخنوری، سخن فہمی اور مطالعۂ کتب میں شب و روز گذارتے رہے۔ چونکہ والد محترم بھی شاعر تھے اور عام طور پر اکمل تخلص کرتے تھے اس لیے سید فضل علی نے اپنا تخلص اسی مناسبت سے افضل رکھ لیا اور شاد عظیم آبادی کی باضابطہ شاگردی اختیار کر لی۔

جنوری 1927 میں شاد کے انتقال کے بعد ان کے تلامذہ نے ''شاد میموریل بورڈ'' کے نام سے ایک ادارہ سر علی امام کی صدارت میں قائم کیا جس کے سکریٹری افضل عظیم آبادی منتخب ہوئے۔ اسی زمانے میں ''تلامیذ الرحمٰن'' نام کی ادبی انجمن کے زیر اہتمام شاد کی یادگار منانے اور ان کے دیوان کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے اور انجمن ترقی اردو پٹنہ کے سکریٹری بھی ہوئے۔ بھاگلپور میں شادی ہونے کے بعد 1927 کے اواخر سے زیادہ تر بھاگلپور ہی میں رہنے لگے۔ گرچہ پٹنہ سے بھی ان کا تعلق زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہا اور یہاں کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے رہے۔ ان کے غزل پڑھنے کا انداز بے حد دلکش تھا جس کا تذکرہ کئی جگہ موجود ہے۔ حافظہ بھی غضب کا تھا اس لیے مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر اشعار کا صرف پہلا لفظ لکھ لیتے اور اشعار سناتے جاتے تھے۔ 19 رجولائی 1969 کو افضل راہی ملک عدم ہوئے۔ علامہ جمیل مظہری نے فارسی اور اردو میں درج ذیل قطعات تاریخ کہے جو ماہنامہ صبح نو، پٹنہ (جولائی اگست 1969) میں شائع ہوئے۔

واحسرتا، ای معظم، شفیقِ ما — رخت سفر بہ بست ازیں عالم فساد
جستم چوں سالِ رحلتش، آمد صدائے غیب — فضل علی بہ قصر جہاں ہم جلیس شاد

1969

رو جمیل اپنے فضلو بھائی کو کہ ترا قدرداں خموش ہوا
ناز تھا جس پہ نکتہ دانی کو آج وہ نکتہ داں خموش ہوا
کہہ رہا ہے سکوت بزم سخن شاد کا ہم زباں خموش ہوا
1389ھ

افضل عظیم آبادی کے شاعرانہ کمال، لفظوں کے مناسب ترین انتخاب اور استعمال نیز ان کی قادرالکلامی کا تذکرہ مختلف مضامین میں ہوتا رہا ہے۔ جمیل مظہری نے تو ایک زمانے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شاد سے فیض یافتہ باقیات الصالحات میں فضل علی صاحب ہی تنہا رہ گئے ہیں جن کے یہاں شاد کا رنگ شاعری پایا جاتا ہے۔ مگر ان کا بیشتر کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ مختلف وسیلوں سے طرحی مشاعروں میں کہی گئی جو غزلیں دستیاب ہوئیں ان کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں۔

دشمن ہے مری جو مرے قاتل کی ادا ہے — تلوار نہیں ہاتھ میں، مٹھی میں قضا ہے
غم خوار نہ ہمدم نہ کوئی راہ نما ہے — کیوں شام غریب الوطنی، آہ یہ کیا ہے
آوارگی شوق کا اللہ نگہباں — پہنچی ہے وہاں جس کا ٹھکانا نہ پتا ہے
آگاہ ہیں لذت سے شہیدان محبت — کیا خضرؑ کو معلوم جو مرنے میں مزا ہے
اے خونِ جگر! شرم کہ تو اڑ کے نہ پہنچا — سنتا ہوں کہ اس شوخ کے ہاتھوں میں حنا ہے

بت کافر نے خدا جانے یہ کیوں ہنس کے کہا — آپ سمجھے تھے کہ آساں ہے مسلماں ہونا
تھا کوئی بار امانت کا اٹھانے والا — خیریت سب کے لیے تھی مرا انساں ہونا
تیرے پردے کی بھی حد ہوگئی اے جلوۂ ناز — میرے معصوم تصور سے بھی پنہاں ہونا
بے حیا عمر تجھے شرم سے گڑ جانا تھا — موت کا آکے ترے پاس پشیماں ہونا

میں سرد آہوں سے گرمایا گیا ہوں — بڑی حکمت سے بہلایا گیا ہوں
ذرا تو ہی بتا زندانِ ہستی — میں زنجیروں میں کیوں لایا گیا ہوں
بھیانک منزلیں دشوار راہیں — میں اے افضل کہاں لایا گیا ہوں

زندگی کے آخری ایام میں کہے گئے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہپ عمر ہے رواں، ہاتھ سے چھٹ گئی عناں — پاؤں میں شہسوار کے الجھی ہوئی رکاب ہے

نہ جانے کس نے اتنی لذتیں دیں عمر فانی کو — جسے دیکھو حریصِ زندگی معلوم ہوتا ہے

بہار ان کی خطائیں معاف کر دینا — خزاں نصیب ترا انتظار کر نہ سکے

اطہر شیر

سید اطہر شیر ولد اصغر شیر کی پیدائش بہار شریف سے اتر پچھم چند میل کے فاصلے پر واقع موضع محسن پور (ضلع نالندہ) کے ایک زمیندار گھرانے میں یکم مارچ 1929 کو ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد متوسط طبقے کے زمینداروں کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہ اس خانوادے کو بھی پیش آئے۔ انھوں نے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے سال سوم میں داخلہ لیا اور 1948 میں جب انھیں عالم کی سند حاصل ہوئی اس وقت تک خاندان کے اکثر لوگ آبائی وطن چھوڑ چکے تھے۔ اس لیے 1949 میں پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک، 1955 میں پٹنہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد بہار یونیورسٹی سے ایم اے اردو (1957) اور ایم-اے فارسی (1960) کے امتحانات درجہ اول میں پاس کیے اور تینوں ہی امتحانات میں طلائی تمغہ حاصل ہوا۔ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے کچھ دنوں تک ایک کالج میں ملازمت کی اور اسی دوران پی-ایچ-ڈی (عربی) کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ بھی مکمل کیا۔ تقریباً پانچ برسوں تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں فہرست ساز کی حیثیت سے کام کیا اور بعد میں اسی کتب خانہ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوئے۔ چونکہ بہار ایجوکیشن سروس سے وابستہ ہو گئے تھے اس لیے حکومت بہار کے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ ملازمت سے سبک دوشی

کے بعد نیو عظیم آباد کالونی پٹنہ کے نوتعمیر شدہ ذاتی مکان میں رہائش اختیار کی۔ 4/نومبر 1998 (بمطابق 14/رجب 1419ھ) انتقال ہوا اور شاہ گنج قبرستان میں تدفین ہوئی۔

سید اطہر شیر ایک باغ و بہار اور ملنسار شخص تھے جو بیک وقت عربی، فارسی، اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان وادب کے واقف کار اور عمدہ انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ادارہ تحقیقات عربی وفارسی کے زیر اہتمام ان کی نگرانی میں بعض اہم ادبی جلسے ہوئے جن میں مرزا عبدالقادر بیدل، امیر خسرو اور اقبال سے متعلق سمینار بعض جہتوں سے آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے عربی وفارسی مخطوطات کی فہرست سازی کا جو کام کیا وہ اپنی نوعیت کا ایک دشوار کام تھا اور بغیر علمی وادبی انہماک اور جانکاری کے اس کا مکمل ہونا محال تھا۔ اس کام کے دوران انھیں نادر مخطوطات کے مطالعے کا بھی موقع ملا جس سے ان کے تبحر علمی میں اضافہ ہوا۔ 1967 میں حکومت ایران نے انھیں ایک سال کا وظیفہ دے کر دانش گاہ تہران میں جدید فارسی پڑھنے کا موقع عطا فرمایا۔ اس دوران انھیں عراق وایران کی سیاحت کا بھی موقع ملا۔

پروفیسر اقبال حسین، سلطان آزاد اور بعض دوسرے راویوں کے بیانات سامنے رکھے جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز مدرسہ عزیزیہ کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ہوگیا تھا۔ ان کے رومانی افسانے رسالۂ عالمگیر، لاہور میں شائع ہوئے۔ اور ماہانہ مشاعروں کے لیے لکھی گئی غزلیں صباتخلص کے ساتھ ملک کے اہم رسالوں میں منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے سفرنامہ بھی لکھا، انشائیہ بھی اور تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی قلم بند کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی کثیر الجہات (Multi dimensional) ادبی شخصیات اب کم یاب ہوتی جارہی ہیں۔

اطہر شیر کی تصنیفات وتالیفات کی ایک مختصر سی فہرست درج ذیل ہے؛

1 لالہ زار (سفرنامہ ایران وعراق) 1969

2 زیر لب (ایک درجن انشائیوں کا مجموعہ) 1990۔

3 فہرست مخطوطات فارسی جلد سوم (مراۃ العلوم)۔

4 فہرست مخطوطات عربی جلد سوم

5 فہرست مخطوطات عربی متعلق تفسیر قرآن (توضیحی کیٹلاگ، بہ زبان انگریزی)

6 فہرست مخطوطات عربی متعلق حدیث۔

اکرام شبنم

سید اکرام الحق (قلمی نام اکرام شبنم) ابن سید قمر الباری، شیر گھاٹی (ضلع گیا) میں تعلیمی سند کے اعتبار سے 17 رجنوری 1934 کو پیدا ہوئے۔ والد ریلوے کے ملازم تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ اور دوسرے رشتہ داروں کی نگرانی میں ہوئی۔ 1951 میں رنگ لال ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ان دنوں یہ امتحان پٹنہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوا کرتا تھا اور سرفہرست رہنے والے طالب علم کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ گرچہ اس سال گیا ہائی اسکول سنٹر سے امتحان دینے والے طلباء کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر بالآخر اکرام شبنم نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے یہ وظیفہ حاصل کیا اور اپنی ذہانت اور محنت کے سبب پٹنہ کالج میں داخلہ کے حقدار ہوئے۔ 59-1958 میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (انگریزی) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد چند مہینہ مدھوبنی کے ایک کالج میں ملازمت کی اور اس کے بعد کالج آف کامرس، پٹنہ کے شعبۂ انگریزی میں استاد ہو گئے۔ وہیں سے صدر شعبہ کی حیثیت سے جنوری 1996 میں سبکدوش ہوئے۔ اس دوران مگدھ یونیورسٹی کی سینیٹ اور سینڈیکیٹ کے ممبر بنے اور آخری دنوں تک اساتذہ کی تنظیم FUSTAB کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ 1951 میں شادی ہو گئی تھی۔ اس سے ماشاء اللہ دو

بیٹے ارمان سہیل اکرام اور عاصم اکرام اور دو بیٹیاں ہیں جو تعلیم یافتہ اور آسودہ حال ہیں۔

8 دسمبر 1998 کو انتقال ہوا۔ مسجد درگاہ شاہ ارزاں کے احاطے میں نماز جنازہ ہوئی اور شاہ گنج قبرستان (پٹنہ) میں آسودۂ خاک ہوئے۔ واحد نظیر نے سالِ وفات اس طرح بیان کیا ہے

پڑھ کرم، اکرام کو جو سال رحلت ہے طلب　　مرقد اکرام شبنم پر ہو بارش نور کی
1998

ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ایک باب ساجد علی خاں کے تحقیقی مقالہ برائے پی-ایچ ڈی- (مگدھ یونیورسٹی 1991) میں موجود ہے۔

اکرام شبنم کی ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ نویں کلاس کے طالب علم تھے۔ شیر گھاٹی میں ان کے خاص دوست ظہیر احسن اور ماسٹر سراج تھے۔ یہ دونوں ہی شعر و شاعری کے رسیا تھے۔ اکرام الحق نے بھی اس طرف توجہ دی اور ایک غزل لکھ کر کلکتہ کے کسی اخبار میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ موقوف رہا مگر پٹنہ آنے کے بعد پھر مشق سخن جاری ہوئی اور نظموں کے علاوہ کم و بیش ایک سو غزلیں کہیں جو شائع تو بہت کم ہوئیں مگر مشاعروں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان کی نظموں کا مزاج غزلوں سے خاصا مختلف رہا۔ ویسے نہ صرف نظریاتی اعتبار سے بلکہ عملی طور پر بھی اکرام شبنم ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک سرگرم یونین لیڈر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ مشہور ترقی پسند شعرا مثلاً سردار جعفری، ساحر اور کیفی اعظمی سے قریب رہے، کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار رسالے ''مسائل'' سے جڑے رہے اور International 1970 Anti Facist Conference کا افتتاح ان ہی کی ایک نظم سے ''اپنا'' کے فنکاروں نے کیا جس کے ابتدائی بول تھے

ہر دور کے ہٹلر کو مٹا دیتے ہیں ہم لوگ　　انصاف کی سولی پہ چڑھا دیتے ہیں ہم لوگ

یہاں تک کہ ان کی نظموں میں اس طرح کے اشعار بھی جگہ پاتے رہے

حسن پژمردہ، مجبور، افسردہ دل
اس کے چہرے پہ بے رونقی
اس کی آنکھوں میں ویرانہ پن
اس کے ماتھے پہ پیہم اذیت کی گہری شکن
عشق پا بستہ، بے بس، حزیں، سرنگوں
اس کے چہرے پہ صدیوں کی ناکامیوں کی تھکن

آخرش زندگی

اپنا مجروح چہرہ چھپائے ہوئے

اک نئی صبح کی ختظر (نظم: بیدروایت سہی)

اس کے باوجود ان کی غزلیں ذہن کی کلاسیکی آراستگی اور روایت سے وابستگی کا ہی پتہ دیتی ہیں۔ موصوف کی ایک دستخط شدہ قلمی بیاض دیکھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ بعض غزلیں کئی قسطوں میں مکمل ہوئی ہیں اور عام طور سے آل انڈیا ریڈیو کے لیے کہی گئی ہیں۔ بہرحال 1953 سے 1973 کے دوران کہی گئی چند مقبول غزلوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:-

تری آنکھ کا اشارہ مری جاں بدل نہ جائے — وہ جو ڈگمگا چکا ہے کہیں پھر سنبھل نہ جائے
نئے مے کشوں نے بدلا ہے اصول رقص صہبا — مرا جام چھونے والے ترا ہاتھ جل نہ جائے
ذرا سوچ لو نشیمن کو مرے جلانے والو — جو یہ آگ اور بھڑکی تو چمن بھی جل نہ جائے

زنداں ہے کہیں اور کہیں دیوار ہے یارو — دل کتنی بلاؤں میں گرفتار ہے یارو
دشوار ہوا اور بھی جلووں کا نظارا — پردہ تھا جہاں اب وہاں دیوار ہے یارو

جو تمھارے دل میں ہو وہ بے حجابانہ کہو — ہم کو دیوانہ سمجھتے ہو تو دیوانہ کہو
خاک چہرے پر نہ کوئی پاؤں میں زنجیر تھی — اپنے دیوانے کو تم نے کیسے پہچانا کہو

پھر ان کا پیغام ملا ہے — منہ مانگا انعام ملا ہے
جب گردن راون کی کٹی ہے — تب سیتا کو رام ملا ہے

عشق وہ کشتی جو طوفاں کا اڑاتی ہے مذاق — عقل وہ ناؤ جو ساحل پہ ٹھہر جاتی ہے
تیرے اوصاف نہیں دیکھتا کوئی شبنم — تیری کمزوری پہ دنیا کی نظر جاتی ہے

دست ساقی سے جام لیتا ہوں — عقل سے انتقام لیتا ہوں
دوڑ پڑتے ہیں سارے دیوانے — جب بہاروں کا نام لیتا ہوں

اکرام شبنم نے انگریزی اور اردو میں کئی اہم مقالے اور بعض کتابوں کے دیباچے بھی لکھے تھے جن کا اب سراغ ملنا مشکل ہے۔

اقبال حسین

اقبال حسین ولد خان صاحب الحاج احمد حسین تعلیمی سند کے اعتبار سے 22/نومبر 1905 کو نیورہ (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ 1922 میں میٹرک 1926 میں، بی-اے (فارسی آنرز) 1928 میں، ایم-اے فارسی (گولڈ میڈلسٹ) کے امتحانات پاس کرنے کے بعد "ہندوستان کی فارسی شاعری" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی-ایچ-ڈی کی سند حاصل کی۔ 1935 میں راونشو کالج کٹک (اڑیسہ) میں فارسی کے استاد ہوئے۔ اور 1936 سے پٹنہ کالج میں ملازمت کی۔

یہاں 1958 سے 1972 کے دوران مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی رہے، پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے، آرٹس فیکلٹی کے ڈین بنائے گئے، پٹنہ یونیورسٹی سینٹ، سنڈیکیٹ اور اکادمک کاؤنسل کے ممبر رہے۔ اس دوران 1961 سے 1965 کے دوران بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور 67-1965 کے دوران خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر بھی ہوئے۔ تقریباً نو برسوں تک بہار اسٹیٹ مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کے اعزازی چیرمین اور 1979-1978 کے درمیان یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ 25/دسمبر 1930 کو صوبہ بہار کی مشہور شخصیت ریاست حسین بیرسٹر کی اکلوتی بیٹی فخر النسا سے شادی ہوئی جن سے تین بیٹے

مقبول حسین، اکبر حسین اور اشرف حسین ہوئے۔ اب یہ تینوں بھی ملازمتوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ 15 رفروری 1991 کو ان کا انتقال ہوا اور پیر موہانی قبرستان پٹنہ میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کا تذکرہ تو مختلف کتابوں میں ملتا ہے مگر حالات زندگی نہیں ملتے۔ میں نے بھی بیشتر اطلاعات ان ہی کی خودنوشت سے حاصل کی ہیں۔

اقبال حسین نے ہند ایرانی شاعروں پر کئی اہم مقالے لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کی شہرت عام کا سبب زندگی کے آخری دور میں لکھی جانے والی خودنوشت ''داستاں سیری'' (مطبوعہ 1989) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے عہد اور ثقافت کی آئینہ داری کے لحاظ سے یہ خود نوشت اردو کی چند اہم سوانح عمریوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اور یہ ایک بے حد اہم معیار ہے جس پر اردو کی اکثر اہم خودنوشت سوانح عمریاں کھری نہیں اتر تیں۔ اس خودنوشت کے پہلے حصے میں اپنے خاندان اور آباواجداد کا تعارف پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں اپنے عہد کی اہم سماجی، ادبی اور سیاسی شخصیات اور محفلوں کا حال بیان ہوا ہے۔ اسلوب عام طور سے رواں اور شگفتہ ہے اور مصنف کا یہ دعویٰ بھی بہت حد تک درست ہے:

> ''سوانح حیات میں حقیقت نگاری بڑی مشکل چیز ہے مگر میں نے واقعات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی قسم کی رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ اپنے دور کے تمام رسم ورواج اور طرز معاشرت کو جیسا میں نے پایا بلا کم وبیش بیان کر دیا ہے۔ معاصرین کے متعلق جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے انصاف سے کام لیتے ہوئے ان کی سچی تصویریں پیش کی ہیں''۔

(دیباچہ۔ داستان میری ص 4)

اعجاز شاہین

اعجاز فاطمہ (قلمی نام: اعجاز شاہین) بنت محمد خلیل پٹنہ کے محلہ عالم گنج میں تعلیمی سند کے مطابق 7 رجنوری 1940 کو پیدا ہوئیں۔ بی۔این۔آر۔ ٹریننگ کالج، پٹنہ سے 1957 میں میٹرک پاس کیا۔ مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ یونیورسٹی سے 1962 میں بی۔اے کیا۔ پھر 1965 میں پٹنہ ٹریننگ کالج سے بی۔ایڈ کا امتحان پاس کر کے 1966 سے ایوب گرلس ہائی اسکول پٹنہ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگیں۔ اس کے بعد 1972 میں ایم۔اے اردو کرنے کے بعد پی ایچ۔ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اسی دوران شادی بھی ہوئی مگر لاولد رہیں اور ازدواجی زندگی بہت خوش گوار نہیں گذری۔ اسکول کی ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے 1978 میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئیں اور ملازمت کے دوران ہی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر 10 راگست 1991 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ وہ ایک اچھی معلمہ کے ساتھ ساتھ پرخلوص سماجی خدمت گار بھی تھیں۔ اردو داں بچوں اور بچیوں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں۔

اعجاز شاہین کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں سے ہوا مگر کب، یہ کہنا

مشکل ہے۔ ''یہ وادیاں'' میں ان کا جو تعارف درج ہے اس کے حساب سے ان کی پہلی کہانی 56-1955 میں شائع ہوئی جب وہ نویں درجے کی طالبہ تھیں۔ احمد حسین آزاد (مقالہ مطبوعہ زبان و ادب، پٹنہ جولائی 1979) کے مطابق ان کا پہلا افسانہ 1962 میں چھپا۔ سلطان آزاد کا خیال ہے کہ ان کی نثر نگاری کا آغاز 1958 سے ہوا اور 1964 سے انھوں نے سہیل عظیم آبادی سے باضابطہ اصلاح لینی شروع کی۔ مجھے اپنی تلاش و جستجو کے نتیجے میں ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ ''ٹھنڈے آنسو'' ماہنامہ صبح نو، پٹنہ (مدیر: وفا ملک پوری) کے جولائی 1963 کے شمارے میں ملا۔ یہ ایک روایتی انداز کی کہانی ہے جس میں شوہر کی بے وفائی کے سبب وفادار بیوی کو جان گنوانی پڑتی ہے۔ مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کہانی صالحہ عابد حسین اور محمود واجد جیسے مشاہیر کے افسانوں کے ساتھ چھپی ہے۔ کسی بھی نئے افسانہ نگار کے لیے یہ پذیرائی کم نہیں ہے۔

بہر حال 1975 میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اعجاز شاہین کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''تصور اور تصویر'' زیور پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کا انتساب پرنسپل ایوب گرلس ہائی اسکول قمر النساء بیگم کے نام ہے اور پیش لفظ پروفیسر عبدالمغنی کا لکھا ہوا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''یہ وادیاں'' بہار اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے 1983 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس میں کل سترہ افسانے ہیں۔ انتساب والدہ محترمہ کی ادب نوازی کے نام ہے۔ اس افسانوی مجموعے پر رائے دیتے ہوئے ناصر زیدی نے لکھا ہے کہ وہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو افسانے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں۔ اکرام علی راشد کی رائے ہے کہ ان کی اکثر کہانیوں میں خود ان کا چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے۔ احمد حسین آزاد کا بھی کم و بیش یہی خیال ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ بالعموم عام فہم زبان لکھتی ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی نے توقع ظاہر کی ہے کہ ان کا فن زیادہ وسعت و رفعت کی منزلوں کی طرف پیہم بڑھتا جائے گا۔ شاید ان کی یہ توقع پوری بھی ہو جاتی مگر علالت نے اعجاز شاہین کو زیادہ مہلت نہیں دی۔ ان کی کئی غیر مطبوعہ کہانیوں اور بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کو دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ خدا جانے یہ سرمایہ منظر عام پر آسکے گا یا ضائع ہو جائے گا۔

ارتضیٰ کریم

سید علی کریم ولد سید شرافت کریم کی پیدائش تعلیمی سند کے اعتبار سے 27/اکتوبر 1959 کو گیا (بہار) کے ایک علمی و ادبی خانوادے میں ہوئی۔ ان کی ننیہال دیسنہ (بہار شریف) ہے اور بقول خود اس لحاظ سے ان کا سلسلہ مستند عالم دین اور معروف ادیب مولانا سید سلیمان ندوی سے مل جاتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے آبائی شہر میں ہی ہوئی جہاں ڈاکٹر سید محمد حسنین، کلام حیدری اور پروفیسر وہاب اشرفی جیسے اکابرین کی رہنمائی انہیں میسر رہی۔ مگدھ یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ کچھ دنوں ذاکر حسین کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد 1987 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں 2006 سے بحیثیت پروفیسر کام کر رہے ہیں۔ اس دوران 2008 سے 2011 کے دوران صدر شعبۂ اردو بھی رہے اور شعبۂ اردو کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر 27/تا29/اپریل 2011 کے دوران ایک یادگار بین الاقوامی ادبی کانفرنس منعقد کر کے اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ جون 2015 سے حکومت ہند کے باوقار ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) نئی دہلی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی شخصیت کے بعض پہلو میری نگاہ میں بے حد اہم رہے۔ بدلہ لینے سے زیادہ معاف کر دینے کی فطرت، کھلنڈرے پن سے گلے ملتی ہوئی سنجیدگی اور متانت، خود ہی نئے ہدف متعین کر کے انہیں حاصل کرنے کی چاہت، عزت سادات خطرے میں پڑ جانے کی پرواہ کیے بغیر حق گوئی کی جرأت اور دل میں دشمنیاں پالنے کی جگہ برسر محفل اختلاف رائے کی عادت ان کی شخصیت کو دلآویز بناتی ہے۔

جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ابتدا سے ہی اردو ادب کا ایک عالمی منظر نامہ ان کی نگاہ میں رہا ہے۔ اس کا پہلا ثبوت دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ وہ بین الاقوامی سمینار تھا جس میں کم و بیش پندرہ ممالک کے مندوبین کے ساتھ میں بھی شریک تھا اور اردو کی چوکھٹ پہ اقتدار کے اعلیٰ مسند نشینوں کو سرنگوں دیکھ کر مجھے بے حد حیرانی ہوئی تھی۔ آج بھی ارتضیٰ کریم کی وہ دور اندیشی اور انتظامی صلاحیت ان کے ہمراہ ہے بلکہ غیر معمولی مالی وسائل کے سبب اس میں اضافہ ہی ہوا ہے اس لیے وہ قومی کونسل کے زیر اہتمام پابندی سے ایسے ادبی جلسے منعقد کرتے رہتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی پہلی مطبوعہ اردو کتاب ''آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب'' بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے 1986 میں منظر عام پر آئی تھی۔ بظاہر یہ ایم۔اے اردو کے لیے لکھا گیا ایک اشاریہ ہے جس میں مطبوعہ کتابوں کے سن اشاعت، ناشر، صفحات کی تعداد اور صنفی نوعیت وغیرہ کے علاوہ ان کتابوں پر مختصر تبصرے بھی شامل ہیں جو موصوف کے ابتدائی تنقیدی شعور کی گواہی دیتے ہیں۔ معروف صحافی اور افسانہ نگار کلام حیدری نے کتاب کے فلیپ پر مصنف سے متعلق جو دعاء مانگی تھی وہ بلا شبہ قبول ہوئی ہے۔ انھوں نے لکھا تھا: ''یہ کتاب کام آنے والی کتاب ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ معاش کی خاطر کوئی بھی پیشہ اختیار کریں ادب سے ان کا رشتہ اٹوٹ ثابت ہو''۔ اس طرح کے کاموں کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ مصنف کو متن کے ساتھ براہ راست رابطہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ کتابوں کو دیکھے اور پڑھے بغیر ان سے متعلق ساری تفصیلات مع تبصرہ و تعارف پیش نہیں کی جا سکتیں۔ ارتضیٰ کریم کا یہ انداز کار آج بھی قائم ہے اور وہ دوسروں کو بھی متن سے براہ راست مکالمے کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔

ان کی تمام تر تصنیفات کا مطالعہ مجموعی طور پر یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ کلاسیکی ادبی شعور سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کو عہد حاضر کے ادبی مطالعات میں بروئے کار لانے پر بھی قادر ہیں۔ میری

نظر میں تحقیق وتنقید کا ایک خوب صورت امتزاج ہی ان کی ادبی کاوشوں کی پہچان ہے۔اس حوالے سے ان کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔انھوں نے اردو فکشن کی تنقید پر بطور خاص توجہ دی ہے اور اس سلسلے میں لکھی گئی ان کی کتاب پوری اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تصنیفات وتالیفات (تا حال) کی ایک مختصر سی فہرست درج ذیل ہے:

-1	آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب	1986
-2	عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ	1987
-3	موضوعات (مجموعۂ مضامین)	1989
-4	کلام میر سوز (کلاسیک)	1991
-5	قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ	1992 (پہلی بار)
-6	اردو فکشن کی تنقید (کئی ایڈیشن)	1996 (پہلی بار)
-7	انتظار حسین: ایک دبستان	1996
-8	مختلف (تنقیدی مضامین)	1998
-9	جوگندر پال: فن اور فنکار	1999
-10	جدید تنقید کا منظر نامہ	---
-11	اردو میں پاپولر لٹریچر: روایت اور اہمیت	---
-12	اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے	2004
-13	آغا حشر: عہد اور ادب	2006
-14	معرکہ وہاب اشرفی، شمس الرحمٰن فاروقی	2000
-15	مکالمات (مجموعۂ مضامین)	
-16	پریم چند اور مابعد جدیدیت (مضامین)	
-17	مجاز: شخص اور شاعر	2015

ابوالکلام عزیزی

ابوالکلام عزیزی ابن محمد ابونعیم 3 رجنوری 1953 کو محلہ عماد پور، بہار شریف (نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اپنا خاندان زیادہ خوشحال نہ تھا مگر نانیہال میں دولت کی فراوانی تھی۔ اس لیے ان کے نانا جان مولانا سید محمد سلیمان نے ان کی تعلیم اور پرورش کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انھوں نے عالم تک عربی کی تعلیم دلوائی مگر وہ جلد ہی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ کچھ دنوں بعد والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس لیے نالندہ کالج بہار شریف سے آئی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ پٹنہ آگئے۔ بہار اردو اکادمی میں ملازمت ملی تو سہیل عظیم آبادی اور شین مظفر پوری جیسے افسانہ نگاروں کی صحبت نے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ 1980 سے افسانہ نگاری شروع کی۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے اور تقریباً ایک سو کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئی ہیں یا آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ''ذرا سی بات'' 1989 میں منظر عام پہ آچکا ہے۔ جو بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔ ایک اور افسانوی مجموعہ زیر طبع ہے۔ فی الحال بہار اردو اکادمی میں خوش نویس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ 2008 میں فریضہ حج ادا کر چکے ہیں اور فی الحال محلہ خان مرزا سلطان گنج، پٹنہ میں قیام پزیر ہیں۔

عزیزی کے زیادہ تر افسانے بیانیہ کی روایتی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ روایت سے ان کی وابستگی اور مثبت طرز فکر بیشتر افسانوں میں نمایاں ہے۔ ویسے ان کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کا الم انگیز اختتام ہے۔ ان کے افسانوں کے مرکزی کردار عام طور پر کسی نہ کسی ٹریجڈی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گرچہ یہ اختتام تاثیر میں اضافہ کا سبب بنتا ہے مگر اس سے ایک نوع کی یکسانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور دلکشی ان کے یہاں نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

احسان اشرف

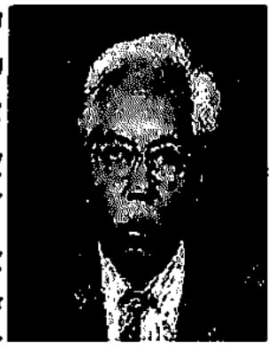

احسان اشرف والد سید محمد سلیمان کی تاریخ پیدائش تعلیمی سند کے اعتبار سے 2/جنوری 1939 ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے 1959 میں ایم۔اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا۔ 1968 میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور مقامی کالج آف کامرس (مگدھ یونیورسٹی) میں فلسفہ کے استاد ہوگئے۔ یہیں سے پروفیسر و صدر شعبۂ فلسفہ کی حیثیت سے 2001 میں ریٹائر ہوئے۔ فی الحال پٹنہ کے کنکر باغ کالونی میں تعمیر شدہ ذاتی مکان میں اہلیہ کے ساتھ مستقل طور پر قیام پذیر ہیں اور تصنیف و تالیف کے علاوہ سماجی خدمت کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اولاد میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

احسان اشرف کا خاص میدان فلسفہ ہے اور انھوں نے فلسفہ کے موضوع پر کئی قابل قدر مضامین لکھے ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی درج ذیل تصنیفات اہم کہی جاسکتی ہیں:

(الف) غزالی، اقبال اور ابن رشد کا فلسفہ (ب) اسلامی تصوف

(ج) مشرق و مغرب کے مشہور مسلم مفکرین (زیر طبع)

اردو کے حوالے سے ان کی مجموعی خدمات تین مختلف النوع خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ انجمن ترقی اردو اور جامعہ اردو (علی گڑھ) کے وسیلے سے وہ اردو زبان کے فروغ کے لیے گزشتہ چالیس برسوں سے کوشاں رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ظریفانہ مضامین اور انشائیے لکھے ہیں جن کا مجموعہ ''دامن کو ذرا دیکھ'' کے نام سے 1973 میں شائع ہو چکا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''وجودیت کا فلسفہ'' (مطبوعہ 2010) قومی کونسل برائے فروغ اردو کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی ہے جس میں موصوف نے وجودیت کے فلسفے کو نہ صرف بے حد سہل زبان میں اردو والوں کے روبرو پیش کیا ہے بلکہ اس کے دائرہ کار، رشتوں، موضوعات وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور آخر میں چند اہم وجودی مفکرین کے خیالات کا مختصراً جائزہ بھی لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیر سے سہی مگر اردو میں احسان اشرف نے ایک نئے انداز کا کام شروع کیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق جلد ہی وجودی مفکرین سے متعلق ان کی ایک اور کتاب منظر عام پر آ رہی ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد وہ دیگر مشرقی و مغربی مفکرین پر بھی اردو میں کوئی کتاب لکھ کر اس زبان کے سرمائے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کریں۔

احسان اشرف کی مذکورہ بالا کتاب ''وجودیت کا فلسفہ'' پر مختلف رسالوں میں حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے ہیں جن میں اس کتاب کے دو امتیازات کی نشاندہی بطور خاص کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد کام ہے۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف وجودی فکر بلکہ مختلف وجودی مفکرین کے ادبی انسلاکات کی طرف احسان اشرف نے خاصی توجہ دی ہے۔ میں اپنی طرف سے بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فلسفے کے مباحث خاصے پیچیدہ اور تہدار ہوتے ہیں۔ انھیں عام فہم زبان میں حوالوں اور تجزیوں کے ساتھ پیش کرنا دشوار کام ہے۔ احسان اشرف اس دشوار مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔

اسلم آزاد

اسلم آزاد ابن محمد عباس مولانا نگر ضلع سیتا مڑھی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے ان کا نام محمد اسلم اور تخلص اسلم لکھا ہے، پروفیسر وہاب اشرفی نے تاریخ پیدائش 12 دسمبر 1948 لکھی ہے۔ مگر تعلیمی سند کے مطابق ان کا نام اسلم آزاد اور تاریخ پیدائش 22 دسمبر 1948 ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق والدین نے ابتدا میں ان کا نام عطا اللہ محمد اسلم رکھا تھا مگر بعد میں اسے بدل کر اسلم آزاد کر دیا۔ انھوں نے پوپری ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد 1966 میں ملت کالج دربھنگہ سے بی۔اے (اردو آنرز) اور 1969 میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ 1974 میں پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ اور فروری 1975 سے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر ہو گئے۔ ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچے۔ ادب کے ساتھ ساتھ سرگرم سیاست سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے اور اس کا انھیں صلہ بھی ملا۔ 2006 میں وہ چھ برسوں کے لیے بہار قانون ساز کونسل ممبر نامزد کیے گئے۔ انھوں نے دو شادیاں کی ہیں۔ دوسری بیوی فرزانہ خود بھی علم و ادب کا ذوق رکھتی ہیں اور نثر نگار ہیں۔

اسلم آزاد شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور ناقد بھی۔ شعر و شاعری کا شوق انھیں اوائل عمر سے

رہا ہے اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ''نشاط کرب'' (مطبوعہ 1968) طالب علمی کے دور میں ہی شائع ہوا تھا۔ شاید اسی لیے پروفیسر وہاب اشرفی نے انھیں بنیادی طور پہ شاعر قرار دیا ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''مختلف'' تقریباً پندرہ برس پہلے منظر عام پہ آیا تھا۔ ان دونوں شعری مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلم آزاد کے یہاں ایک فطری ذہنی ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے مجموعے میں غزلوں کا رنگ عام طور پہ رومانی ہے جس میں 'چمن کی جان ہو رعنائی بہار ہو تم' اور 'کہ روح اسلم آزاد کی پکار ہو تم' جیسے بیانات کی روشنی میں نوجوان اسلم آزاد کی افتاد طبع کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کم و بیش اسی زمانے میں انھوں نے کچھ افسانے بھی لکھے جو بیسویں صدی، دہلی اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے۔ ان افسانوں کا مزاج بھی رومانیت سے عبارت ہے۔ ان کے کلاسیکی رنگ سخن کی عکاسی ایک طرحی غزل کے یہ اشعار کرتے ہیں

خانہ خستہ کی صورت ہوئی حالت میری　　کوئی دیوار سلامت ہے نہ اب چھت میری
میرے سجدوں سے منور ہے تری راہ گذار　　میری پیشانی پہ روشن ہے صداقت میری

جب کہ دوسرا شعری مجموعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ شاعری کی نئی روایت سے استفادے کا عمل ان کے یہاں تیز ہوا ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کے آئینہ دار ہیں

سعی لاحاصل سہی پر دیکھتے　　ریت پر اک نام لکھ کر دیکھتے
کرب کی آگ میں دن رات پگھلتے رہیے　　کروٹیں درد کے بستر پہ بدلتے رہیے
تپتے صحرا میں رہا ہوں میں ازل سے لوگو　　جی میں آتا ہے کہ پی جاؤں سمندر کتنے

وہ نظم نگار بھی ہیں مگر انھوں نے چند پابند نظموں سے قطع نظر عام طور پر آزاد نظمیں ہی لکھی ہیں۔ استاد محترم پروفیسر اختر اورینوی کی وفات پر لکھی گئی انکی مختصر سی نظم جو شدت احساس کا نمونہ تھی، بے حد مقبول ہوئی۔

اسلم آزاد کسی خاص تنقیدی روش کے پابند نہیں ہیں۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ہے جس کا پہلا ایڈیشن دسمبر 1981 میں نکھار پبلی کیشن نے شائع کیا تھا۔ یہ ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی ہے جو ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا ہے۔ ان کی دوسری کتابیں مثلاً عزیز احمد بحیثیت ناول نگار، آنگن۔ ایک تنقیدی جائزہ اور ''قرۃ العین حیدر'' بحیثیت ناول نگار (مطبوعہ 2003) بھی اردو فکشن کی تنقید سے متعلق ہیں اور پہلی کتاب کا تتمہ کہی جا سکتی ہیں۔ میں نے موخر الذکر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''پروفیسر اسلم آزاد مختلف آرا کو یکجا کر کے ان کے حسن و قبح پر گفتگو کرنے اور پھر کسی نتیجے تک پہنچنے کا طریقہ جانتے ہیں جس کا ایک نمونہ یہ کتاب بھی ہے۔ قرۃ العین حیدر پہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تجزیاتی یا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے بعض امور کی تکرار ناگزیر تھی۔ اس کے باوجود اسلم آزاد کے بیانات میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔'' (زبان وادب پٹنہ جنوری 2005)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ رائے معمولی ترمیم کے ساتھ ان کی دوسری تنقیدی کتابوں پر بھی صادق آتی ہے۔

اسلم آزاد نے مختلف اخبارات و رسائل بھی نکالے جن میں سہ ماہی 'شباب' کو اولیت حاصل ہے۔ مگر ان رسائل کی اشاعت محدود رہی اور وہ زیادہ دنوں تک نہیں جاری رہ سکے۔

اسرائیل رضا

اسرائیل رضا ابن محمد رضا اپنے آبائی وطن واقع مکامہ (ضلع پٹنہ) میں تعلیمی سند کے مطابق 9/اکتوبر 1948 کو ایک پسماندہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام محمد اسلم رکھا تھا مگر تعلیمی سند کے مطابق محمد اسرائیل ہوگیا۔ والد کے نام کی مناسبت سے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ رضا کی کنیت اختیار کرلی۔ رضا نے ابتدائی تعلیم مکامہ میں ہی مولوی ابوالقاسم سے حاصل کی۔ آر۔ایس۔ایم ہائی اسکول سے 1964 میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ 1968 میں پٹنہ کالج سے بی۔اے اردو آنرز کیا اور میرٹ اسکالرشپ حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے 1970 میں ایم۔اے اردو کرنے کے بعد پروفیسر ممتاز احمد کی نگرانی میں ''رضیہ خاتون جمیلہ۔ حیات اور شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر 1987 میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ اسی سال شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہوئے جہاں اب ریڈر کے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ان۔ایس۔ایس کے پروگرام افسر اور بحیثیت صدر شعبہ بہار اردو اکادمی کے خازن (بہ جہت عہدہ) بھی رہ چکے ہیں۔ مارچ 1968 میں شادی ہوئی۔ ماشاء اللہ چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

اسرائیل رضا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر خالد رشید صبا کی ادارت میں نکلنے والے روز نامہ ''ساتھی'' سے وابستہ ہوئے جہاں لکچرر ہونے تک کام کرتے رہے۔ اس دوران پٹنہ سے شائع ہونے والے دیگر اردو روزناموں، ہفتہ وار اخبارات اور رسائل وجرائد مثلاً سید عمر فرید کے ''قومی تنظیم''، شری کیدار سنگھ کے ''دیس بدیس'' مولانا ولی رحمانی کے ''ایثار'' پروفیسر قاسم احسن وارثی کے ''ہمارا بہار'' وغیرہ سے بھی وابستہ رہے اور سید شرف الدین فاطمی کے ہفتہ وار ''مثلث'' میں اسلم رضا کے نام سے مضامین یا کالم لکھتے رہے۔ روز نامہ ''ساتھی'' میں ان کے کچھ قطعات بھی شائع ہوئے۔

ترجمہ کے باب میں اسرائیل رضا کی خدمات اہم ہیں۔ انھوں نے گوپی چند نارنگ کی تصنیف 'اسلوبیات میر' اور ان کے بعض مقالوں کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا جو ان کی تصنیف ''اردو پر کھلتا ہوا دریچہ'' میں شامل ہیں۔ وہ بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاونسل کی اردو کے شائع کردہ نصابی کتابوں کے مرتبین میں شامل رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ان کی تین کتابیں ''جمیلہ خدا بخش کی غزل گوئی''، ''مثنویات جمیلہ'' اور انداز نظر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) زیر اشاعت ہیں۔ ہندی رسالہ ''کسوٹی'' (مدیر: نند کشور نول) میں بھی انکے ترجمہ کئے ہوئے کافی مضامین شریک اشاعت رہے ہیں۔

اسلام عشرت

محمد اسلام الدین (قلمی نام اسلام عشرت) ولد الحاج مولانا محمد نظام الدین شمسی، تعلیمی سند کے اعتبار سے 22/دسمبر 1955 کو اورنگ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ ہوئی۔ اورنگ آباد سے ہی بی۔اے۔ آنرس (اردو) کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1976-1974 سیشن میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ (اردو) کیا۔ پھر بی۔ایڈ اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے اور 1984 میں اسی یونیورسٹی سے ''خلیل الرحمٰن اعظمی: حیات اور شاعری'' کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد بی۔ایس۔کالج، داناپور کے شعبۂ اردو میں ملازمت مل گئی۔ جہاں فی الحال صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اہلیہ بھی علم وادب کا ذوق رکھتی ہیں اور درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

اسلام عشرت کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے لیے لکھی گئی ایک کہانی ''انصاف'' سے ہوا جو ماہنامہ ''نور'' (رام پور، اتر پردیش) میں اپریل 1969 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ پہلا افسانہ ''نقلی چہرے'' ماہنامہ ''خاتون مشرق'' دہلی (نومبر 1971) میں چھپا اور پہلی غزل ماہنامہ ''سبد گل'' کلکتہ (جنوری 1971) میں منظر عام پر آئی۔ پہلا تنقیدی مضمون ''اردو میں ڈرامہ نگاری'' ہفتہ وار ''مورچہ''

گیا (5 راپریل 1975) میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کی چند غزلیں "نئے افکار" پروگرام کے تحت آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ سے نشر ہوئیں۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام عشرت کی ادبی دلچسپیاں متنوع تھیں اور انھوں نے اپنی کوئی واضح راہ متعین نہیں کی تھی۔ مگر چند برسوں کے بعد ہی وہ پوری طرح اردو تحقیق وتنقید کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کے سبب کامیاب بھی ہوئے۔ 1981 میں انھیں بہار اردو اکادمی کی جانب سے دیا جانے والا پہلا ریسرچ اسکالر ایوارڈ ملا۔ 1988 میں اکادمی نے ان کی تصنیف "خلیل الرحمٰن اعظمی: ترقی پسندی سے جدیدیت تک" کو انعام سے نوازا۔ اپریل 1997 میں وہ بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد کیے گئے اور اسی سال انھیں حکومت بہار کے محکمہ راج بھاشا سے "جاں نثار اختر — شاعر جدید" کی اشاعت کے لیے اعزاز بھی ملا اور 2002 میں ساہتیہ کار سنسد کی جانب سے ڈاکٹر عنوان چشتی ایوارڈ حاصل ہوا۔ 2000 سے اب تک وہ آدھ درجن سے زائد قومی سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں اور ان کے ساٹھ سے زیادہ مقالات ومضامین ہند وپاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی اہم تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ کلام حیدری بہ حیثیت افسانہ نگار (تنقید) مطبوعہ 1985
2۔ خلیل الرحمٰن اعظمی: ترقی پسندی سے جدیدیت تک (تحقیق وتنقید) 1988
3۔ جاں نثار اختر — شاعر جدید (تنقید) 2000
4۔ میزان اور مباحث (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)، 2009

اسلام عشرت ابھی سرگرم کار ہیں اور ادبی دنیا کو ان سے بہت ساری توقعات ہیں۔

ابھے کمار بے باک

ابھے کمار اپادھیائے ولد پنڈت دواکر اپادھیائے تعلیمی سند کے اعتبار سے 20/جولائی 1957 کو گاؤں مٹیرا جگدیش، لار، ضلع دیوریہ اتر پردیش کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں مختلف فنون لطیفہ اور تصوف کا چرچا تھا۔ والد آل انڈیا ریڈیو کے مستقل فنکار اور غزل گائیکی کے مشہور استاد تھے۔ اسی ماحول میں ابھے کمار اپادھیائے نے فلسفہ اور تصوف کی کتابیں پڑھیں۔ فراق گورکھپوری جیسے بزرگوں سے ملاقات کا فیض اٹھایا، الہ آباد یونیورسٹی کے علمی و ادبی ماحول میں شب و روز گزارتے ہوئے ایم-اے (جدید تاریخ) کا امتحان پاس کیا اور پھر یونین پبلک سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے 1984 میں آئی۔ پی۔ ایس ہوئے۔ محکمۂ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے۔ 1995 سے مستقل طور پر پٹنہ میں ہیں گرچہ ملازمت کے سلسلے میں کئی جگہوں پر تبادلہ ہوتا رہا ہے۔ شاعری کی ابتدا 1980 میں ہوئی اور اپنے نام ''ابھے'' کے ساتھ بے باک تخلص رکھ لیا۔ 2011 میں ان کا مجموعہ کلام ''خمار خواب'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بے باک کی غزلوں کے بیشتر موضوعات فلسفہ اور تصوف کے زیر سایہ پروان چڑھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی فکر کا ایک خاص دائرہ ہے جس سے باہر وہ بہت کم قدم رکھتے

ہیں۔ان کی غزلوں کا دوسرا امتیاز لب و لہجے کی روانی اور شائستگی ہے۔کلاسیکی غزل کے پورے شعور کو اپنی فکر کا حصہ بنا کر نئے مطالبات اور تجربات سے ہم آمیز کرنا آسان کام نہیں۔مگر بے باک اس ہنرمندی کے ساتھ یہ کام کرتے ہیں کہ ان کی قادرالکلامی پہ حیرت ہوتی ہے۔میں نمونے کے طور پر چند اشعار نقل کرتا ہوں

مرا دیا ہے مقابل چراغ شاہی کے — میں جانتا ہوں کہ آثار ہیں تباہی کے
ہمارے گھر ہیں معطر غموں کی دھونی سے — کہ ان گھروں پہ ہیں اثرات خانقاہی کے
کبھی خودی کو بھی خاطر میں لائے بے باک — ہزار رنگ نظر آئیں گے الٰہی کے

میرا خیال ہے کہ عہد حاضر میں فکری وفنی پختگی کے حامل بہت کم اشعار ان اشعار کی برابری کر سکتے ہیں۔فلسفہ اور تصوف کی کارفرمائی سے مزین چند اور خوب صورت اشعار دیکھئے

راستے جس نے بنائے وہی منزل بھی ہے — ہم تو آئے ہیں یہاں یوں ہی گزرنے کے لیے

دیر تک جاگی ہوئی آنکھوں میں کٹی رات کو — چند خوابیدہ چراغوں کا دھواں کچھ کم نہیں

اختتام مسافرت کے سوا — اور کیا منزلوں میں ہوتا ہے
ایک دریا کی لاج رکھنے کو — فاصلہ ساحلوں میں ہوتا ہے
ساتھ دیتے ہیں راستے بھی جب — حوصلہ قافلوں میں ہوتا ہے

گیتا کا کرو پاٹھ کہ قرآں کی تلاوت — ناپاک ارادوں سے عبادت نہیں ہوتی
یادوں کے سوا چھوڑ کے جانا ہے سبھی کو — گھر بار لیے پھرنے سے ہجرت نہیں ہوتی

بیباک نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ موضوعات کی جو نیرنگی یہاں ملتی ہے وہ ایک علیحدہ مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔رباعی کے روایتی پیرہن میں عہد حاضر کے نئے احساسات و تجربات کو انھوں نے بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔یہاں فلسفہ اور تصوف کی چھاؤں سے زیادہ حقیقت کی دھوپ کا منظر ملتا ہے۔دو مثالیں ملاحظہ ہوں

سوئے ہوئے جو خواب ہیں بیدار تو ہوں
جمہور کی راحت کے کچھ آثار تو ہوں

34

جنگل کے قوانین بدلنے کے لیے
سردار قبیلوں کے بھی تیار تو ہوں

سردی کبھی گرمی کبھی آئی برسات
بدلے نہ مگر گاؤں کے پھر بھی حالات
تم شہر میں رہتے ہو تمھیں کیا معلوم
کٹتے ہیں یہاں کیسے ہمارے دن رات

اثر فریدی

ایاز الدین فریدی (قلمی نام :اثر فریدی) ولد عظیم الدین فریدی 2راگست 1956 کو محلہ برتلہ، سہسرام میں پیدا ہوئے۔ آئی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں پٹنہ آگئے اور یہیں تجارت میں مشغول رہے۔ ادبی مرکز پٹنہ کے جوائنٹ سکریٹری اور ارباب بہار کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے خاصے فعال ہیں۔مشاعروں میں تحت اللفظ پڑھتے ہیں مگر کامیاب ہوتے ہیں۔اب تک لگ بھگ تین سو غزلیں اور نظمیں معروف ومعتبر ادبی رسائل مثلاً آج کل (دہلی) مباحثہ (پٹنہ) زبان وادب (پٹنہ) مریخ (پٹنہ) شہود (کلکتہ) تمثیل نو (دربھنگہ) مژگاں (کلکتہ) اور علم وادب (لکھنیاں) وغیرہ میں شائع ہوچکی ہیں۔آل انڈیا ریڈیو، اور دوردرشن پٹنہ کے مختلف شعری وادبی پروگراموں میں 1980 سے برابر بحیثیت شاعر شریک ہوتے رہے ہیں۔غزلوں اور نظموں کے علاوہ نعت گوئی کی طرف بھی گاہے گاہے توجہ کرتے ہیں۔صوبہ بہار اور پڑوسی ریاستوں کے مشاعروں میں کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ''سوچنا چاہیے'' کے عنوان سے زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے۔

اثر فریدی ایک براہ راست مگر موثر لب ولہجے کے شاعر ہیں۔انھوں نے اقدار کی پاسداری عام لوگوں کی دل داری اور فقیری میں بادشاہی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔اسی نسبت سے اردو شاعری کے

مختلف موضوعات ان کے منفرد لب و لہجے کے ساتھ ان کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نعتیہ کلام میں کوئی جدت نہیں مگر شاعر کا خلوص نمایاں ہے۔ نعت کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

رسول پاکؐ کا رتبہ بتا دیا جائے — قرآن پاک کو پڑھ کر سنا دیا جائے
اثر فریدی کی خواہش یہی ہے دنیا میں — حبیب پاکؐ کا روضہ دکھا دیا جائے

غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

خانقاہوں کا جو منصب ہے وہی میرا ہے — یعنی خوشبو کا جو مذہب ہے وہی میرا ہے
مجھ کو معلوم نہیں کس کی بلندی کیا ہے — جس کے سینے میں بسا رب ہے وہی میرا ہے
چاہے مسجد ہو کہ مندر ہو کہ ہو گرجا گھر — چاند اور جگنو کا جو ڈھب ہے وہی میرا ہے

چاولوں کے سبھی دانے نہیں دیکھے جاتے — ہو محبت تو گھرانے نہیں دیکھے جاتے
صرف محسوس کر وہم کو زمانے والو — ہم فقیروں کے خزانے نہیں دیکھے جاتے
شخصیت اپنی سنورتی ہے خود اپنی صورت — جسم پہ کپڑے پرانے نہیں دیکھے جاتے

ہے دریا دل سمندر بانٹتا ہے — فقیری میں بھی لنگر بانٹتا ہے
وہ خود تو اوڑھتا ہے آسماں کو — مگر لوگوں میں چادر بانٹتا ہے
عجب تاجر ہے کچھ لیتا نہیں ہے — سنہرے خواب گھر گھر بانٹتا ہے
اثر اس کی طبیعت ہی الگ ہے — وہ خود پیاسا ہے ساغر بانٹتا ہے

جو لوگ اثر فریدی کے ذاتی احوال سے واقف ہیں وہ اشعار میں ان کی زندگی کے خد و خال بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اثر فریدی نے اردو شاعری کی اس روایت سے اثرات قبول کئے ہیں جو ایک طرف تصوف اور دوسری طرف کبکلا ہی سے عبارت ہے۔ اپنی شخصیت سے وابستہ تجربات و محسوسات کو وسعت دے کر زندگی کی ایک خاص روش سے ہم آہنگ کر دینا آسان کام نہیں ہے مگر اثر فریدی اس مشکل مرحلے کو بخوبی طے کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی اکثر غزلوں میں فکری انتشار کی جگہ ایک نوع کا تسلسل نظر آتا ہے۔ ان کے بعض اشعار میں فنی خامیاں گراں گذرتی ہیں مگر یہ ایسی لغزشیں ہیں جو مشق سخن یا اصلاح سخن سے بہ آسانی دور ہو سکتی ہیں۔

احمد بدر

سید بدر احمد ابن سید سراج احمد میٹرک سرٹی فکیٹ کے مطابق 9/ فروری 1958 کو مظفر پور کے نواح میں واقع ایک مردم خیز بستی محمد پور مبارک میں پیدا ہوئے۔ دادا سید محمد شوکت مظفر پوری شاعر تھے اور نعت گوئی سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ والد گرچہ پولیس کی ملازمت میں تھے مگر ادبی ذوق کے حامل تھے۔ بستی میں دو اور قابل ذکر ہم عصر رضا مہدی اور اسد رضوی موجود تھے جن کی دوستی نے اوائل عمر سے ہی سید بدر احمد کو احمد بدر کے قلمی نام کے ساتھ شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھنے کی ترغیب دی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں مستقل طور پر اپنی نانیہال خانقاہ معصیہ قمریہ متین گھاٹ پٹنہ سیٹی چلے آئے۔ اس کے بعد پٹنہ سے ہی ایم۔اے (اردو اور فارسی) کے امتحانات پاس کئے اور کچھ عرصے تک شہرۂ آفاق خدا بخش لائبریری میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پھر تقریباً دس سال تک National Literacy Mission کے ریاستی ریسورس سنٹر (ADRI) میں اسسٹنٹ اور ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر کام کیا۔ فی الحال کریم سٹی کالج جمشید پور کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

احمد بدر کی علمی و ادبی سرگرمیاں خاصی متنوع رہی ہیں۔ National Literacy

Mission میں کام کرتے ہوئے انھوں نے اردو ہندی، بھوجپوری اور مگہی زبانوں میں کم وبیش دو درجن پرائمر، پوسٹ لٹریسی کتابوں اور ڈیڑھ سو سے زیادہ Continuing Education کی کتابوں کو تیار کرنے میں اپنا تعاون دیا۔اس دوران وہ ادبی خدمات بھی انجام دیتے رہے اور مختلف علاقائی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کیے جو اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور فارسی زبانوں میں شائع ہوئے۔رسالہ زبان وادب (پٹنہ) المعلم (پٹنہ) انعکاس (مظفر پور) ہماری آواز (میرٹھ) اور درون (دہلی) وغیرہ میں ان کے کچھ تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔غزلوں کے علاوہ نظم نگاری، حمد اور نعت سے بھی آپ کا تعلق ہے اور گاہے گاہے رسالوں میں ان کی شعری تخلیقات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔2012 میں آپ کا سفرنامہ حج ''کہاں سے لوٹ آئے'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

احمد بدر باصلاحیت نثر نگار اور جدید احساس کے شاعر ہیں۔ایک خاص لہجہ کی تشبیہات واستعارات کا استعمال ان کی غزلوں کو پختگی اور تازہ کاری کا حسن عطا کرتا ہے۔نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل پیش ہے۔

بھٹک رہا ہوں لیے جسم و جان شیشے کا
کہیں تو ہوگا کوئی قدردان شیشے کا

غزل کو میں نے کیا ترجمان شیشے کا
مرے سخن میں ہے شامل بیان شیشے کا

مرا رفیق مرا غم گسار دیرینہ
اک آئینہ ہے مگر بے زبان شیشے کا

اسی نے مے کی کشش کو کیا ہے دو بالا
حجاب سا جو رہا درمیان شیشے کا

ہر ایک رات نئی سازشیں ہیں پتھر کی
ہر ایک صبح نیا امتحان شیشے کا

ضروری سایہ نہیں، سائے کا گھنا احساس
بلا سے سر پہ رہے سائبان شیشے کا

انا کی چھت کے تلے خود پرست دیواریں
اسی کو کہتے ہیں دانا مکان شیشے کا

اختر واصف

اختر واصف ابن الحاج نور محمد انصاری یکم مارچ 1956 کو آرہ میں پیدا ہوئے۔ والد حکومت بہار کے محکمۂ ایمپلائمنٹ میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ اس لیے اپنے دوسرے تین بھائیوں کی طرح واصف کو بھی حصولِ تعلیم کے لیے ایک سازگار ماحول ملا۔ انھوں نے بی۔اے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد پٹنہ کی راہ لی۔ فی الحال وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر سماجک سرکشا کے عہدے پر کام کر رہے ہیں اور پٹنہ کے معروف محلے عالم گنج کی شاہ کالونی میں مقیم ہیں۔ دو بھائی شکیل اختر اور جاوید اختر ہندوستان سے باہر ہیں اور ایک پرویز اختر ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز ہیں۔

اختر واصف کی پہلی کہانی 1973 میں ہفتہ وار ''مورچہ'' گیا میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد رسالہ 'آہنگ' گیا 'تحریک' اور 'آج کل' (دہلی) شاعر، شعر و حکمت، زبان و ادب، مباحثہ اور سطور وغیرہ میں مختلف کہانیاں چھپتی رہی ہیں۔ جن میں ''دیواریں ہنستی ہیں''، ''کچھ الم غلم چیزیں'' دوسرے درجے کا ٹکٹ۔ محبت کی ایک کہانی، 'ہاتھ' اور ''ریت میں گڑے ہوئے پاؤں'' قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کئی کہانیاں آکاش وانی پٹنہ سے نشر بھی ہو چکی ہیں۔ اب تک وہ تقریباً ایک سو کہانیاں لکھ چکے ہیں اور ان کا ایک افسانوی مجموعہ، ''کچھ الم غلم چیزیں'' کے نام سے زیر اشاعت ہے۔

اختر واصف کے افسانوں کا سب سے نمایاں وصف ان کی سادگی اور شگفتگی ہے۔ انھوں نے عام طور سے سماج کے دبے کچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی تلاش پہ زور دیا ہے۔ ان کے کرداروں کی مستقل محرومیاں اور ان کے تئیں سماج کی بے حسی اختر واصف کا خاص موضوع ہے۔ اس کے علاوہ سماجی زندگی کی ناہمواریاں اور پیچیدگیاں بھی ان کی نگاہ میں ہیں جنہیں وہ سادہ بیانیہ انداز میں پیش کرنے پہ قادر ہیں۔ ان کی بعض کہانیوں پر استعارہ کا ہلکا سا پردہ محسوس کیا جا سکتا ہے مگر علامت یا ابہام سے ان کی زیادہ قربت کبھی نہیں رہی۔ اس اعتبار سے وہ جدیدیت کے دور عروج میں افسانہ نگاری کا آغاز کرنے کے باوجود ایک انفرادیت کے حامل رہے ہیں۔

استاد پٹنوی

آفاق احمد (قلمی نام استاد پٹنوی) ابن جناب مشتاق احمد ہائی اسکول سرٹی فکیٹ کے مطابق 30/جون 1974 کو تارنی پرساد لین (گھسیاری گلی) پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے آنرس پاس کرنے کے بعد تجارت سے وابستہ ہوگئے۔ علمی وادبی محفلوں میں شرکت اور اہل ادب سے قربت کے سبب مزاج لڑکپن سے ہی شاعرانہ تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو باضابطہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور شفیع احمد فاطمی کی شاگردی اختیار کرلی۔ ان کے ظریفانہ قطعات پابندی کے ساتھ مقامی روز ناموں میں شائع ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں مگر کلام کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔

استاد پٹنوی کی ظریفانہ شاعری کا اصل جوہر Topical Issues کو پیش کرتے ہوئے سامنے آتا ہے۔ روز ناموں میں پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے ظرافت نگاروں کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ رفتار زمانہ پر نظر رکھیں اور ہر ناہموار چال پہ گرفت کریں۔ استاد پٹنوی اپنی غزلوں اور بطور خاص قطعات کے ذریعہ یہ کام بخوبی کر رہے ہیں۔ پیروڈی کی مثالیں بھی ان کے یہاں موجود ہیں اور ان میں بھی تاثیر کی کمی نہیں 2004 میں ہونے والے پارلیامانی انتخاب میں محترمہ سونیا گاندھی اور شری اٹل بہاری باجپئی کی معرکہ آرائی کے پس منظر میں یہ شعر کافی مشہور ہوا تھا:

اُدھر کمزور عورت ہے اِدھر کمزور گھٹنا ہے
پریشانی میں جتنا ہے کہ طاقت کس کو دی جائے

یہ قطعات بھی خاصے مقبول ہوئے ہیں۔

بدن پر اب نظر آتے ہیں بس بالشت بھر کپڑے
مگر جب غور سے دیکھو تو یہ محسوس ہوتا ہے

لگی تہذیب نو کو ہے یہ عریانی کی بیماری
امیروں کا یہ فیشن ہے غریبوں کی ہے لاچاری

پرنسپل نے ایک لڑکی سے کہا
Optional جو چاہئے لے لیجے

میرے کالج کا یہی قانون ہے
Love مگر Compulsory مضمون ہے

ماں رو رو کے کہتی تھی یہ کیسی ہوئی شادی
شوہر نے کہا، روتی ہو بیکار ہی بیگم

داماد نے جو کچھ تھا مرے پاس سمیٹا
کچھ صبر کرو، دوگنا لے آئے گا بیٹا

اشرف جہاں

اشرف جہاں ولد محمد فخر الدین ہزاری باغ (موجودہ ریاست جھارکھنڈ) میں تعلیمی سند کے مطابق 21 جنوری 1951 کو پیدا ہوئیں۔ آباواجداد زمیندار تھے جن کے گاؤں پرانے ضلع گیا (موجودہ جہان آباد) اور پٹنہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ نانیہال ارکی (جہان آباد) اور دادیہال ندول (ضلع پٹنہ) ہے۔ 1947 کے فسادات میں خاندان کے اکثر لوگ ختم ہوگئے اور جو بچے وہ گیا، پٹنہ اور دوسرے شہروں کی طرف نکل گئے۔ ان کے چچا ڈاکٹر قمر الدین اور والد نے عظیم آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ اشرف جہاں بھی کسی ایک جگہ قیام پذیر نہیں رہ سکیں۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان بھاگلپور سے اور بی۔ اے کا امتحان آرہ میں واقع مگدھ یونیورسٹی کے کالج سے کیا۔ ایم۔ اے (اردو) اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1973 میں انجینئر نذیر الدین حیدر سے شادی ہوئی جن سے تین بچیاں اور ایک بیٹا ہے جو زیر تعلیم ہے۔ ملازمت کی ابتدا گورنمنٹ گرلس کالج، گردنی باغ پٹنہ کے شعبۂ اردو سے کی۔ فی الحال پٹنہ کالج میں ریڈر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

اشرف جہاں کے والد پولیس انسپکٹر تھے اور خاندان میں تعلیم اور ملازمت کی ابتدا بھی انھیں سے ہوئی تھی۔ اس لیے اشرف جہاں کا ادبی ذوق ان کے اپنے ہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ویسے تو انھوں نے

کالج میگزین میں کچھ مضامین اور ۱۱ افسانے لکھے تھے مگر ان کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز رسالہ ''حریم'' میں ایک افسانے کی اشاعت سے 1979 میں ہوا۔ اس کے بعد ان کی تحریریں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ حال ہی میں رسالہ ''شاعر'' ممبئی نے ان پر ایک ''گوشہ'' شائع کیا ہے۔

اشرف جہاں کی تحریروں کا امتیاز ان کا سادہ اور براہ راست انداز بیان اور اصلاحی نقطہ نظر ہے۔ اسلوب میں طنز و مزاح کی ہلکی سی آمیزش ان کے بعض افسانوں کو مزید دلکشی عطا کرتی ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

(1) صورۃ الخیال (شاد کا ناول) کا تنقیدی جائزہ، (2) شناخت (افسانوی مجموعہ)

(3) ہم اردو کے ٹیچر ہوئے (طنز و ظرافت)، (4) اکیسویں صدی کی نرملا (افسانوی مجموعہ 2010)

اشرف النبی قیصر

اشرف النبی (تخلص قیصر) ولد ڈاکٹر محمد جمال نبی، خواجہ چاند چھپرہ (ضلع ویشالی) میں تعلیمی سند کے مطابق یکم مئی 1956 کو پیدا ہوئے۔ ان کی دادیہال شاہ پور بگھوئی (ضلع سمستی پور) میں تھی مگر پوری فیملی پہلے ویشالی اور پھر پٹنہ منتقل ہوگئی۔ انھوں نے 1971 میں رام موہن رائے سیمنری پٹنہ سے میٹرک اور 1977 میں اورینٹل کالج پٹنہ سے بی۔ اے اردو آنرز کا امتحان پاس کیا۔ 1982 میں ایم۔ اے اردو اور 1988 میں ڈاکٹر عبدالواسع کی نگرانی میں ''علامہ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اسی دوران فروری 1980 میں شادی ہوئی اور 1983 میں محکمہ راج بھاشا حکومت بہار میں ملازمت بھی مل گئی۔

اشرف النبی کی ادبی خدمات کے دو پہلو ہیں۔ انھوں نے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے بعد قانون اردو پر عمل درآمد کے مرحلوں میں خاموشی کے ساتھ بنیادی کام کیا ہے۔ جس سے اردو کو دفتروں کی زبان بنانے اور اس کو فروغ کی راہ ہموار کرنے میں خاصی مدد ملی ہے۔ دوسرے وہ خود بھی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی کاوشوں سے محکمہ راج بھاشا کے ادبی ترجمان ''بھاشا سنگم'' کا اجراء ہوا تھا اور وہ اس کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ تھے۔ گرچہ یہ رسالہ

ابتدا سے ہی اشاعت کی بے قاعدگی کا شکار رہا مگر اب تک اس کے چند خوبصورت شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ویسے اشرف النبی دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی سماجی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین اور کالم لکھتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین مقامی اخبارات کے علاوہ ''اندیشہ'' اور ''مرخ'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کچھ اچھی غزلیں بھی کہی ہیں مگر شاعر کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں۔ 1985-87 کے دوران انھوں نے ''سب رنگ'' کے زیر اہتمام کبیر داس پر قابل ذکر کام کیا تھا۔ 1983 میں انھیں لائنس کلب (Lions Club) کی جانب سے ادبی و سماجی کاموں کے لیے ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اردو زبان اور صحافت کے حوالے سے ان کی خدمات اہم ہیں مگر ان کی کسی شاہ کار تخلیق کا ابھی انتظار ہے۔

اظہار خضر

اظہار خضر ولد قیوم خضر تعلیمی سند کے اعتبار سے 17 رجنوری 1955 کو پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ حمیدہ بانو ہر سال اپنے مائیکے واقع دیناج پور (اس وقت کا مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش) جاتی تھیں۔ وہیں اظہار خضر کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیا میں گھر پہ ہی حاصل کی اور پانچ برس کی عمر سے مستقل طور پر پٹنہ آ گئے۔ محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ پہلے 1975 کالج آف کامرس پٹنہ سے بی۔ایس۔سی اور پھر 1977 میں اورینٹل کالج سے بی۔اے (اردو آنرز) کے امتحانات پاس کیے۔ 1980 میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے اردو ایم۔اے کا امتحان دیا اور جولائی 1978 سے بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلیشنگ کارپوریشن میں ملازم ہو گئے۔ جہاں تا حال ایڈیٹوریل سکشن کے شعبہ اردو میں نصابی کتابوں کی تیاری سے وابستہ ہیں۔ 1988 میں نگار تبسم بنت محمد شمیم (رانچی) سے شادی ہوئی جن سے تین بیٹے ہیں۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے اظہار خضر کی مشغولیات کے تین خاص پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنے والد مرحوم قیوم خضر کی غیر مطبوعہ تحریروں کو جمع کیا، ان پر مقدمے لکھے اور ضروری حواشی کے ساتھ انھیں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اس سلسلے میں مختلف مشاہیر اردو کے خطوط اور بعض نادر

تحریریں ان کے ہاتھ آئیں جنھیں وہ ترتیب دے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کی درسی کتابوں کی تیاری میں بھی اہم رول ادا کیا اور خود بھی غیر ادبی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا جو بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک کارپوریشن سے شائع ہوئیں۔ اردو زبان کی ابتدائی تعلیم کے لیے انھوں نے چند ابتدائی قاعدے بھی ترتیب دیے۔ وہ اردو زبان و ادب کے اہم موضوعات پر مختلف رسائل میں مضامین لکھتے رہے ہیں جن کا ایک مجموعہ ''زبان کی جمالیات'' کے نام سے 2007 میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کی ایک قابل ذکر ادبی کاوش ''مانپوری — احوال و آثار'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے مارچ 2010 میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اظہار خضر کی تحقیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت دونوں کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے انجم مانپوری جیسے اہم ظرافت نگار کا ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں کے تناظر میں بھرپور مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں دیگر مشاہیر اردو کی رائیں بھی سامنے رکھی ہیں۔ آخر میں مانپوری کی تحریروں کا ایک انتخاب بھی ہے۔ ان دونوں کتابوں کا اسلوب بے حد شگفتہ ہے۔ اطلاعات کے مطابق اردو کی چند نمائندہ کہانیوں کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل اظہار خضر کی ایک کتاب ''تجزیہ'' زیر اشاعت ہے جب کہ خدیجہ مستور کے فن پر ایک کتاب زیر تکمیل ہے۔

ایم۔ عظیم اللہ

محمد عظیم اللہ (تخلص عظیم) ابن الحاج محمد اظہار حسین تعلیمی سند کے اعتبار سے 19 دسمبر 1949 کو مظفر پور کے درہی پٹی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ تین بھائیوں میں یہ سب سے بڑے ہیں۔ دوسرے بھائی بھی اہم عہدوں پہ فائز ہیں۔ والد اسکول ٹیچر تھے۔ ان ہی کی نگرانی میں عظیم اللہ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1964 میں جمال آباد ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ بی۔اے آنرز (1972) ایم۔اے اردو (1976) اور ایم۔اے فارسی (1980) کے امتحانات بہار یونیورسٹی سے پاس کئے۔ 1986 میں یہیں سے ڈاکٹر ناز قادری کی نگرانی میں ''اردو ناول پہ انگریزی ناول کے اثرات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ 1987 میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ملازمت مل گئی۔ اور بی۔این کالج میں پوسٹنگ ہوئی۔ بعد میں پی جی میں تبادلہ ہوگیا۔

محمد عظیم اللہ شاعر بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن مثلاً حمد، نعت، قطعات، سلام اور غزل پہ طبع آزمائی کی ہے اور بعض اچھے سہرے بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے Topical Issues پر موقع کی مناسبت سے بعض خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر محمد سلیمان، صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی سے مشورۂ سخن کیا۔ اب آزادانہ شعر کہتے ہیں۔ اب تک کم وبیش دو سو غزلیں کہہ

چکے ہیں جن میں سے کچھ بیسویں صدی دہلی اور زبان وادب پٹنہ میں شائع شدہ ہیں اور بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

انھوں نے خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو آج کل (دہلی) کے علاوہ مقامی اخبارات ورسائل مثلاً ''قومی تنظیم'' اور ''پندار'' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے۔اب تک ان کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں:

1۔	اردو شاعری : چند زاویے	1996
2۔	ادبی تناظر	1999
3۔	اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات	2001

اعجاز علی ارشد

تاریخ پیدائش (بہ اعتبار سند) یکم جنوری 1954
جائے پیدائش: دیوان محلہ پٹنہ سیٹی
والد کا نام: (پروفیسر) محمد علی خاں
تعلیم:
میٹرک: محمڈن اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول، پٹنہ سیٹی 1967
بی اے۔ (اردو آنرس): اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی 1971
ایم-اے (اردو) پٹنہ یونیورسٹی 1973
بی-ایڈ مگدھ یونیورسٹی 1974
ایم-اے (فارسی) مگدھ یونیورسٹی 1975
پی-ایچ-ڈی پٹنہ یونیورسٹی (موضوع: نذیر احمد بحیثیت ناول نگار) 1980
ملازمت: 1976 تا 2004 شعبۂ اردو بی این کالج و پٹنہ کالج
ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر پٹنہ یونیورسٹی 2004 تا 2008
ڈین ہیومنٹیز، پٹنہ یونیورسٹی 2008ء تا 2010
صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی 2008 تا حال
شادی: اکتوبر 1976، بیٹے دو بیٹی ایک

بیرون ملک سفر :

1985 (لندن) بہ سلسلہ گولڈن جوبلی تقریبات ترقی پسند مصنفین
2004 یورپ کے مختلف ممالک بہ سلسلہ جشن اردو تقریبات
2004 ابوظہبی، دبئی برائے سیاحت
2007 مسقط (عمان) بہ سلسلہ ادبی لکچر
2010 سعودی عرب بہ سلسلہ حج

اہم تصنیفات وتالیفات :

1۔	نشاط غم (مجموعۂ کلام زار عظیم آبادی۔ ترتیب مع مقدمہ)	1976
2۔	حرف تمنا (مجموعۂ کلام معین کوثر۔ ترتیب مع مقدمہ)	1978
3۔	بہار میں اردو تنقید (تنقید)۔	1981
4۔	نذیر احمد کی ناول نگاری (تحقیق وتنقید)	1984
5۔	کرسی اور کرسی (طنز ومزاح)	1986
6۔	بال جبرئیل۔ ایک مطالعہ (تنقید)	1986
7۔	اسلوب ومعنی (تنقیدی مضامین)	1989
8۔	منثورات جمیل مظہری (ترتیب مع مقدمہ) (دو جلدوں میں)	1991
9۔	کرشن چندر کی ناول نگاری (تنقید)	2000
10۔	سید عاشور کاظمی :فن کار اور فن	2001
11۔	دعوت اور عداوت (طنز ومزاح)	2002
12۔	ہم عصر اردو فکشن چند زاویے (تنقید)	2010
13۔	بہار کی بہار/عظیم آباد: جلد اوّل (بیسویں صدی میں)	2010
14۔	اردو شاعری کے چند زاویے	2014
15۔	ہم میر ہوئے نہ وزیر ہوئے	(زیر طبع)

امتیاز احمد

امتیاز احمد ابن پروفیسر قیام الدین احمد تعلیمی سند کے مطابق 18/ نومبر 1953 کو محلہ خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ اور میٹرک تک محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (تاریخ) اور پی-ایچ ڈی (موضوع : عبدالرحیم خانخاناں) کیا۔ 1978 میں ٹی-این-بی کالج بھاگلپور میں ملازمت ملی۔ 1979 سے 2004 تک پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ فی الحال خدابخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری میں ڈائرکٹر ہیں۔

امتیاز احمد صاحب بنیادی طور پر تاریخ (عہد متوسط کی ہندوستانی تاریخ) سے وابستہ رہے ہیں اور اس عہد سے متعلق ہندی اور انگریزی میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اہم تاریخی موضوعات اور تحریکات سے متعلق ان کے تقریباً چار درجن مقالے ملک اور بیرون ملک کے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ اردو ادب سے ان کی قربت طالب علمی کے دور سے رہی ہے جب وہ اپنے استاد ناصر زیدی کی نگرانی میں بچوں کے لیے نکلنے والے رسالہ ''شگوفہ'' سے وابستہ رہے۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے علمی و ادبی مضامین لکھنے کا آغاز انھوں نے 1979 کے آس پاس کیا

اور اب تک ایک درجن سے زیادہ وقیع مضامین وہ مختلف مواقع کے لیے لکھ چکے ہیں۔ اس طرح کے چند اہم مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ ویودا سیاں: تاریخ کی روشنی میں۔ زبان وادب پٹنہ جولائی 1979
2۔ شاد عظیم آبادی بحیثیت مورخ۔ اصول، پٹنہ شاد نمبر 1979
3۔ رمز عظیم آبادی کی شاعری پس منظر و محرکات۔ وہ سنگ میل جو لپٹا ہوا غبار میں تھا (مجموعہ) پٹنہ 2002
4۔ ایک درویش ایسا بھی اردو مرکز پٹنہ 2003
5۔ ابن بطوطہ اور اس کا سفر نامہ (چار حصوں میں)۔ مخدوم بہار شریف 2003-2002
6۔ کبیر اور ان کا عہد۔ کبیر کے موضوع پر قومی سمینار منعقدہ پٹنہ 2003
7۔ جمیل مظہری اور کل کا عظیم آباد: ایک جائزہ۔ ذکر جمیل۔ پٹنہ 2006
8۔ راجہ رام نرائن موزوں۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق اور حسن نعیم پر مضامین۔ مطبوعہ 2012
(اردو ساہتیہ کے وکاس میں بہاری وبھوتیوں کا یوگ دان)

اردو ہندی یا انگریزی میں لکھے گئے امتیاز احمد کے مقالات کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کے مطالعے کی ایک خاص سمت رہی ہے۔ انھوں نے عام طور پر تاریخ نویسی کی اس زرّیں روایت سے خود کو وابستہ رکھنا چاہا ہے جو سید حسن عسکری اور قیام الدین احمد کی روایت رہی ہے۔ بعض اہم ادبی شخصیات اور موضوعات کا جائزہ بھی انھوں نے اسی پس منظر میں لیا ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک امتیاز ہے چونکہ اردو میں اس نہج سے لکھنے والے اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

بلبیر سنگھ بھسین

بلبیر سنگھ بھسین (تخلص مرید) ولد بھگوان سنگھ پردیسی تعلیمی سند کے اعتبار سے 11 راگست 1936 میں غیر منقسم ہندوستان کے اس علاقے میں پیدا ہوئے جو اب پاکستان میں ہے۔ ان کا گاؤں مرید کہلاتا تھا چونکہ اس میں تین پیروں کے مزارات تھے۔ زیادہ تر آبادی شیعہ مسلمانوں کی ہونے کے باوجود سکھوں کو پورا تحفظ حاصل تھا اور وہ نہ صرف ثقافتی وتہذیبی اجتماعات میں بلکہ مذہبی اور ادبی مواقع پر بھی پیش پیش رہتے تھے۔ والد شاعر تھے اور 1944 کے آس پاس قومی ایکتا کے جذبے سے سرشار ان کی ایک نظم بے حد مقبول ہوئی تھی جس کا آغاز اس طرح ہوتا تھا

یہ میرا گاؤں مریدوں کا   جتھ میلا لگتا عیدوں کا

تقسیم ہند سے چند دن قبل یہ خاندان ہجرت کے مسائل جھیلتا ہوا دوراہا منڈی (پنجاب) پہنچا۔ وہاں سے لدھیانہ گیا اور پھر رام گڑھ (موجودہ جھارکھنڈ) چلا آیا جہاں بلبیر سنگھ کے والد ملٹری کیمپ میں کام کرنے لگے تھے۔ بلبیر سنگھ نے جو 1953 سے ہی شاعری سے دلچسپی لیتے ہوئے اپنے آبائی گاؤں کی نسبت سے خود کو مرید لکھتے تھے۔ 1954 میں گاندھی میموریل ہائی اسکول، رام گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ رانچی کالج سے انٹر کرنے کے بعد مستقل طور پہ پٹنہ آگئے۔ 1958 میں

بی۔اے۔آنرز اور 1960 میں ایم۔اے (نفسیات) کا امتحان پاس کرنے کے بعد شری گورو گوبند سنگھ کالج، پٹنہ سیٹی میں پہلے لائبریرین ہوئے اور کچھ دنوں بعد 1961 سے نفسیات پڑھانے لگے۔ ان ہی دنوں میں این۔سی۔سی کی تربیت حاصل کی جس کی وجہ سے میجر بلبیر سنگھ کہلانے لگے۔ 1969 میں یوم جمہوریہ کے موقع پر دہلی میں ہونے والی تقریبات میں بہار کی ٹیم کو پہلی بار انعام ملا۔ انھوں نے تعلیم وتدریس کے میدان میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ پہلے پرنسپل ہوئے اور آخر میں پرووائس چانسلر، مگدھ یونیورسٹی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ حصول تعلیم کے دوران ہی 1959 میں ان کی شادی جسبیر کور سے ہوئی جو بعد میں خود بھی لکچرر ہوگئیں۔ ان سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہیں۔ 2002 میں اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ بلبیر سنگھ کا شعری مجموعہ ''پتھر کی چاہت'' ان ہی کے نام ہے۔

بلبیر سنگھ بھسین کو شاعری وراثت میں ضرور ملی تھی مگر ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو بین المذاہب اتحاد کا نمبردار بنادیا۔ وہ نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ شاعری میں بھی پوری طرح اس مشترکہ کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی ایک مثال اردو زبان بھی رہی ہے۔ ویسے تو انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور بعض اچھے اشعار نکالے ہیں مگر انکی مثبت اور تعمیری فکر زیادہ تر ان کی نظموں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت پر لکھی گئی ان کی نظم اس طرز فکر کا ایک نمونہ ہے۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا اس لیے ان کی غزلیں پوری طرح سے درست نہیں کہی جاسکتی ہیں مگر مجموعی طور پر ان کے یہاں فکر واحساس کی جو صورت ملتی ہے وہ قابل غور ہے۔ ایسے میں ان کے مجموعۂ کلام کے مرتب ڈاکٹر اسلم جاوداں کی یہ رائے مناسب کہی جاسکتی ہے:

> ''آپ جب اس مجموعہ کلام کا مطالعہ کیجئے تو فنی نقاضوں، بحور اور اوزان سے قطع نظر ان کے قیمتی اور عالمانہ خیالات و وسیع تجربات کو دیکھیے۔ ان کی فکری بصیرت کو ملاحظہ کیجئے۔''

مرید کا مجموعہ کلام ''پتھر کی چاہت'' اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی زبانوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں ان کی ایک اور کتاب ''سکھ مت'' خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے چھپی ہے۔ قومی اتحاد اور مذہبی رواداری کے حوالے سے ان کے مضامین مختلف اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھیں مجموعی ادبی خدمات کے لیے بہار اردو اکادمی اور اندرا گاندھی میموریل ایوارڈ برائے قومی ایکتا (1992) حاصل ہو چکا ہے۔ فی الحال وہ خودنوشت سوانح حیات ''ایک سفر: ہندوستان سے ہندوستان تک'' کے نام سے مکمل کر چکے ہیں جس کو اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں میں شائع

کرانے کا ارادہ ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

آج فضاؤں میں مستی ہے ہر سو عکس یاراں ہے　　پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم باد و باراں ہے
پتھر کے سینے سے اس کے آب حیات نکلتا ہے　　لہروں کے کاندھے پر چڑھ کر جانب بحر رواں ہے
آج مریدوں کی بستی پر اس کی نعمت برسے گی　　گر ہو زباں پر نام خدا کا ہر مشکل پھر آساں ہے
میری وفا کے چرچے، ہر سو تیری محبت کی باتیں　　راہِ وفا پر مرمٹنے کو جان و جگر سب قرباں ہے

عشق ہی جن کا خدا، پیار ہے جن کا مذہب　　ان مریدوں کو پریشان کیا جاتا ہے

پرویز شاہدی

سید اکرام حسین (قلمی نام: پرویز شاہدی) ولد سید احمد حسین و سیدہ عائشہ خاتون 21 ستمبر 1910 کو لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال کی عمر تک گھر ہی پر دادا کی نگرانی میں ابتدائی و تربیت ہوئی۔ اور درس نظامیہ کی ساری کتابیں پڑھائی گئیں۔ 1925 میں کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ امیدوار کے طور پہ میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو اور فارسی (1935 و1934) کے علاوہ قانون کا امتحان پاس کیا۔ بقول خود ایک جذباتی صدمے کے تحت انھوں نے 1935 میں پٹنہ کو خیر باد کہہ کر کلکتہ کی بود و باش اختیار کر لی (ملاحظہ ہو "تشکیل حیات") وہاں پہلے اسکول ٹیچر اور صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر 1941 میں مدنا پور کالج کے لکچرر ہوئے۔ 1947 میں رپن کالج کلکتہ میں تقرر ہوا۔ 1958 سے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے جہاں تا مرگ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 5 نومبر 1955 کو بیگم فضیلت النسا بنت مجیب الرحمٰن سے شادی ہوئی۔ اولاد میں صرف ایک لڑکی سمینہ تھی جس کی 10 مارچ 1980 کو شادی ہوئی۔ 5 مئی 1968 کو وفات پائی اور گوبرا قبرستان تلتلا روڈ کلکتہ میں مدفون ہوئے۔ پردادا اور پرنانا دونوں کا نام سید شاہد حسین تھا۔ اسی نسبت سے خود کو شاہدی لکھتے رہے۔ 1944 میں کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت

اختیار کی اور 1948 سے کافی سرگرم سیاست میں آ گئے۔ جس کے سبب 50-1949 کے درمیان قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑی۔

پرویز شاہد کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا یہ کہنا مشکل ہے۔ خود ان کی یال-احمد-اکبر آبادی کی بات پہ اعتبار کیا جائے تو مانا جا سکتا ہے کہ وہ آٹھ نو برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سلطان آزاد کا بیان ہے کہ 1926 سے شعر کہنے لگے تھے اور ثمر آروی نیز ثاقب عظیم آبادی سے اصلاح لیتے تھے۔ ناصر زیدی صاحب کا خیال ہے کہ پرویز کو سب سے پہلے نیاز فتح پوری کے جریدہ نگار، نے 1933 میں اردو کی وسیع دنیا میں روشناس کرایا (مقالہ مطبوعہ زبان و ادب پٹنہ فروری مارچ 1980 ص 117)۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ وہ بھی رومانی جذبوں کی شاہراہ سے گذرتے ہوئے صلیب و دار کی منزل تک آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی ان کی شناخت بن گئی۔ اپنے عہد کے مشہور ترقی پسندوں سے ان کے مراسم قائم ہوئے اور کم از کم صوبہ بنگال کی حد تک وہ ترقی پسند تحریک کے علمبردار بن گئے۔ اس کے باوجود دو چیزوں سے وہ کبھی کنارہ کش نہ ہو سکے۔ ایک تو وہ اخلاق اور وضع داری جو انھیں ورثے میں ملی تھی۔ دوسرے وہ احساس جس کا ایک نمونہ سلاست اور فنکارانہ آراستگی بھی ہوتی ہے۔ پرویز نے صرف تین اصناف سخن یعنی رباعی، نظم اور غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے صرف دو مجموعے رقص حیات (1957) اور ''تثلیث حیات'' (1968) شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع شدہ ہیں۔ ''مریخ'' پٹنہ نے ان پر ایک خصوصی شمارہ دسمبر 1968 میں شائع کیا تھا۔ 1981 میں ماہنامہ زبان و ادب'' پٹنہ نے بھی پرویز شاہدی نمبر نکالا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انھوں نے خالص ترقی پسندوں کے انداز میں بھی کچھ کلام کہا ہے مگر ہنگامی موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے عام طور سے کلاسیکی طرز اظہار کو ترک نہیں کیا۔ شاید یہی ان کی انفرادیت ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جلتے رہنا کام ہے دل کا بجھ جانے سے حاصل کیا
اپنی آگ کے ایندھن ہیں ہم ایندھن کا مستقبل کیا
ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کا
''اندر آنا منع ہے'' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا — شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا
کم سے کم میں غم دنیا کو بھلا سکتا تھا — پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

میں نے دیکھا ہے ترے حسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا

کتنے اصنام نا تراشیدہ پتھروں میں ہی کسمساتے ہیں
کتنے ہی نا شگفتہ لالہ و گل ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ ابھی پردے میں مسکراتے ہیں

(نظم "سازِ مستقبل" سے ماخوذ)

حال ہی میں جناب مسلم شمیم کی ایک کتاب "فکر و فن کے جزیرے" پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ جس کا ایک باب پرویز شاہدی سے متعلق ہے۔ میں اس کی چند سطریں یہاں نقل کرتا ہوں:

"پرویز شاہدی کی شخصیت اور فن، دونوں کا خمیر خلوص و محبت سے تیار ہوا تھا جہاں ریاکاری اور دوہرے معیار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ راہ صداقت کے رہرو تھے اور اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی سچائیوں کو اپنے قلب و نگاہ میں جگہ دیتے تھے اور پھر واردات کی صورت میں اپنی نگارشات کی زینت بناتے تھے۔ وہ عصری صداقتوں کے شاعر تھے۔ عصری آگہی اور سماجی شعور سے بیگانہ فکر و فن سے انھوں نے کبھی رہ و رسم نہیں بنائی"۔

پیامی عظیم آبادی

محمد حسن، المعروف فاروق احمد (قلمی نام: پیامی عظیم آبادی) 25 دسمبر 1909 کو پٹنہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مولوی امانت حسین نے ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد مستقل ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کرنے کے بعد مدرسے اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ خداداد ذہانت کے سبب جلد ہی بنیادی مذہبی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد طب کی تعلیم مکمل کی اور پٹنہ واپس آ گئے۔ مگر ذہن کی آزاد روی کے سبب یہاں بھی نہ کوئی ملازمت کی اور نہ طبابت سے وابستہ ہوئے بلکہ بہت دنوں تک وہ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی، کا نمونہ بنے رہے۔ کبھی گھوڑ سواری، سپہ گری اور کشتی لڑنے کا فن سیکھا اور کبھی کلاسیکی موسیقی میں مہارت حاصل کرنی چاہی۔ کچھ دنوں تک دوستوں کی صحبتوں میں رہ کر جانوروں اور پرندوں کے شکار میں مشغول رہے اور چند برسوں تک فرنیچر کی تجارت اختیار کی۔ ادبی ذوق و شوق کی سیرابی کے لیے بھی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ''بہار پنچ'' کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالا، مجلس ادب کی محفلیں آراستہ کیں اور خود کئی ادبی انجمنیں قائم کر کے مختلف پروگرام منعقد کیے۔ شاعری بھی کی اور کسی خاص صنفِ سخن تک محدود نہیں رہے۔ مضامین لکھے

جن میں ادب کے علاوہ علمی، سماجی اور مخصوص مذہبی موضوعات بھی زیر بحث آئے۔ غرض یہ کہ ان کی غیر ادبی دلچسپیوں کی طرح ادبی فتوحات بھی رنگا رنگ رہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں Spoiled genius تو نہیں کہہ سکتے مگر ان کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کے پیش نظر یہ مصرع ضرور دہرایا جاسکتا ہے کہ ع ہم جیسے لوگ کھیل تماشوں میں بٹ گئے۔

پیامی عظیم آبادی اپنے عہد کے اہم ترین ادبا و شعرا سے بہت قریب رہے اور بہار کے بیشتر رسالوں میں ان کا کلام خاصے اہتمام سے شائع ہوتا رہا۔ فن شاعری پر انھیں قدرت حاصل تھی اس لیے مشاعروں میں بھی مقبول تھے مگر بہت جلد مشاعروں سے کنارہ کش ہو گئے۔ البتہ مخصوص ادبی نشستوں اور احباب کی محفلوں میں کلام سنانا جاری رہا۔ انھوں نے اپنا کلیات ''کان بدخشاں'' کے نام سے خود مرتب کیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد ہی ان کے شعری مجموعوں کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ ان کے لائق فرزند ابو نصر فاروق نے ان کا پہلا مجموعہ ''گنج گہر'' بہار اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کیا۔ جس میں ایک سو اسّی غزلیں ہیں۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''برق و شرر'' ہے جس میں دو سو نو غزلیں ہیں۔ ''بانگ رحیل'' اور ''نور سحر'' بھی آپ کے شعری مجموعے ہیں جن میں غزل، نظم، منقبت، سلام، قطعات و رباعیات، قطعات تاریخ اور طنز و ظرافت کے علاوہ فارسی شاعری کے بھی چند نمونے موجود ہیں۔

پیامی عظیم آبادی کی حیات و خدمات سے متعلق پی-ایچ-ڈی- کے لیے ایک تحقیقی مقالہ ارشد افضل نے بی-ار-اے- بہار یونیورسٹی مظفر پور میں ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی کی نگرانی (1993) میں مکمل کیا تھا مگر یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ 2 رجنوری 1982 کو پیامی کا انتقال ہوا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

نئی روح اور نئے انداز و عنواں لے کے آیا ہوں
پئے احیائے فن میں آب حیواں لے کے آیا ہوں
کسی کے ناز بے جا کا کوئی شکوہ نہیں مجھ کو
تماشہ کیجیے میں زخم خنداں لے کے آیا ہوں
تمیز شیشہ و گوہر پیامی دہر کو کب ہے
پکار و خود، کہ میں کان بدخشاں لے کے آیا ہوں

برق یوں دوڑتی ہے قلب و جگر میں میرے
اک شرر آتا ہے اور ایک شرر جاتا ہے

اسلاف کے باقی نہ ہوں جس قوم میں اوصاف
حاصل اسے ہوسکتی نہیں عظمت اسلاف

پریم کرن

پریم کرن ولد نند کشور پرساد ورما تعلیمی سرٹی فیکٹ کے اعتبار سے 15 رجنوری 1953 کو پٹنہ سیٹی کے آبائی مکان (نزد پٹنہ سیٹی کورٹ) میں پیدا ہوئے۔ عظیم آباد کے کائستھ روساد یسے بھی نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان وادب سے آشنائی رکھنے کے سبب مشہور رہے ہیں۔ مگر پریم کرن کے والد سرکاری ملازمت میں ہونے کے باوجود اردو اور فارسی شاعری کی روایتوں کے دلدادہ تھے۔ اس طرح ابتدا سے ہی انھیں ذوق ادب کی نمو کے لیے ایک سازگار ماحول ملا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول گلزار باغ سے میٹرک اور گیا سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے شعر گوئی کی طرف توجہ کی تو مشہور شاعر رمز عظیم آبادی کی باضابطہ شاگردی میں آ گئے اور ان کے رنگ سخن سے متاثر بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ تقریباً بیس برسوں تک وہ صحافت سے وابستہ رہ کر نو بھارت ٹائمز اور دوسرے اخباروں میں کام کرتے رہے اور گزشتہ چند برسوں سے دانی پرکاشن (دہلی) کی پٹنہ شاخ سے وابستہ ہیں۔

1997 میں ان کی پہلی غزل ہندی رسالے ''ساریکا'' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہندی اور اردو رسالوں، ریڈیو پروگراموں اور مشاعروں کے وسیلے سے ان کی غزلیں برابر سامنے آتی رہیں۔ رمز کی رہنمائی میں انھوں نے بعض نعتیہ اور طرحی مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا اور مقبول ہوئے۔

2008 میں ان کی غزلوں کا مجموعہ" آگ چکھ کر لیجیے" (بہ زبان ہندی) منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل ان کا کلام زبان و ادب، مریخ، مباحثہ اور کتاب نما وغیرہ اردو رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ بعض گلدستوں میں بھی ان کی غزلیں موجود ہیں۔ انھیں 2008 کا "شاد عظیم آبادی سمان" اور بہار اردو اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔

پریم کرن کی ادبی شخصیت ہمارے اس مشترکہ کلچر کی نمائندگی کرتی ہے جس پر ہمیں اب تک فخر ہے۔ انھوں نے ہندی غزل کی بے باکی و بے خوفی اور اردو غزل کی متانت اور شائستگی کی آمیزش سے ایک ایسا لب و لہجہ قائم کیا ہے جس پر مشہور ہندی غزل گو دشینت کمار کے اثرات تو تلاش کیے جا سکتے ہیں مگر اسے غالب اور شاد کی روایت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ شاعر ارون کمل نے ان کی غزلوں کے بارے میں لکھا ہے:

> "جو بات ہر آدمی کے دل میں ہے اسی بات کو پریم کرن نے صاف، اجول بھاشا میں اس طرح پرستت کیا ہے کہ غزل سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔ کہیں کوئی رکاوٹ، کوئی ورودھ، کوئی بوجھ پن یہاں نہیں ہے۔ یہ شاعری سب کی زبان میں سب کی بات ہے۔ یہاں گفتگو عوام سے ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ پریم کرن کی غزلیں زندگی کے ان جذبات اور اقدار کی بازیافت پہ اصرار کرتی ہیں جن کو عہد حاضر کی تہذیب اور کاروباری زندگی نے کہیں دور ڈھکیل دیا ہے۔ ایسے میں ان کی مثبت انداز فکر کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی غزلوں کا آہنگ بھی اردو غزلوں کی روایت کا پروردہ ہے اور انھوں نے اردو شاعری کی تلمیحات، تشبیہات و استعارات وغیرہ سے استفادہ بھی کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی غزلوں میں بعض لفظوں کو ہندی تلفظ کے اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے مگر ایسا ضرورت شعری کے تحت ہمارے بہت سے شعرا کرتے رہے ہیں۔ بہر حال ان کے لہجے کی شفافیت، زبان و بیان کی قدرت اور فکر کی صلابت ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کہی جا سکتی ہے۔ نمونہ کلام کے طور پہ یہ اشعار ملاحظہ ہو

رات آئے گی تو گھر جائیں گے — لاکھ سمٹے ہوں بکھر جائیں گے
گھر بھی ہے کوہ ندا ہی جیسا — دل نہ چاہے گا مگر جائیں گے
لاکھ ہوں دشمن دستار جنوں — ہم اٹھائے ہوئے سر جائیں گے
ہم کرن روشنی دینے کے لیے — تیرگی ہوگی جدھر جائیں گے

نہ میں بولتا ہوں نہ گھر بولتا ہے
سکوتِ شبِ غم مگر بولتا ہے

یہاں بھی کبھی کوئی تہذیب ہوگی
ندی بولتی ہے بھنور بولتا ہے

سمجھتا ہے جو بھی زبان خموشی
اسی آدمی سے کھنڈر بولتا ہے

اوپر اوپر سرد خموشی اندر اندر آگ
ساگر ساگر جنگل جنگل پتھر پتھر آگ

کس بازار سے نیند خریدیں کیسے سوئیں لوگ
کروٹ کروٹ پڑے پھپھولے بستر بستر آگ

پرویز انجم

پرویز انجم ولد محمد اسحاق انصاری (والدہ زلیخا خاتون) تعلیمی سند کے اعتبار سے 8/ مارچ 1965 کو مدھوبنی میں پیدا ہوئے اور 1981 میں میٹرک پاس کرنے کے بعد پٹنہ چلے آئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے اردو اور فارسی کے امتحانات پاس کیے۔ پی-ایچ-ڈی کیا اور فی الحال ایک اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جولائی 2009 میں ان کا مجموعۂ کلام ''لفظوں میں زندگی'' بہار اردو اکادمی کی مالی معاونت سے منظر عام پر آیا ہے۔

پرویز کی شاعری کا امتیاز ان کا سادہ بیان اور عوامی لب ولہجہ ہے۔ وہ بہت خوبصورت ترنم کے ساتھ غزلیں سناتے ہیں اور مشاعروں کے مقبول شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ نعت، منقبت اور گیت وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی نعتوں میں رسول کی بھرپور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جب کہ غزلوں میں عام طور سے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے کچھ نیا رنگ و آہنگ پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ مشق سخن جاری رہے تو ان کے یہاں اچھی شاعری کے مختلف امکانات پوشیدہ ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

جس پہ بھی فیض شہنشاہ مدینہ ہوگا　　چشم فردوس بریں کا وہی تارا ہوگا

جانے کب خواب کی تعبیر نظر آئے گی
جانے کب پیش نظر گنبد خضریٰ ہوگا

میں نے دیکھا تو نہیں پھر بھی یقیں ہے مجھ کو
باغ جنت سے حسیں شہر مدینہ ہوگا

اللہ رے تصوّر جاناں کی برکتیں
صدیاں گزار لیتی ہے لمحوں میں زندگی

اپنے لیے جیے تو کبھی ان کے لیے جیے
یعنی کہ ہم نے کاٹی ہے قسطوں میں زندگی

ترتیب یوں ہی پاتی نہیں ہے کتاب دل
میرا ہنر کہ ڈھال لی لفظوں میں زندگی

دوپہر میں تو دکھاتا ہے بہت جاہ و جلال
شام ہوتی ہے تو ہوتا ہے پشیماں سورج

تسنیم کوثر

تسنیم کوثر بنت سعید اختر تعلیمی سند کے اعتبار سے 30 رمئی 1967 کو پیدا ہوئیں۔ آبائی وطن حیدرنگر، پورنیہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر میں ہوئی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم- اے (تاریخ) اور ایم-اے (اردو) کے امتحانات پاس کرنے کے دوران ہی محمد انوار الحق تبسم ریڈر شعبۂ تاریخ اورینٹل کالج سے شادی ہوگئی۔ تلاش معاش میں آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے بحیثیت نیوز کاسٹر اور نیوز ریڈر وابستہ رہیں اور بعض دوسرے اداروں کی خدمات بھی انجام دیتی رہیں۔ علم وادب سے لگاؤ ابتدا سے ہی تھا جسکی آبیاری میں شریک حیات نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح اردو اور ہندی میں افسانے، ڈرامے اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک و بیرون ملک کے ادبی رسالوں اور مقامی اردو اور ہندی اخباروں میں تخلیقات شائع ہونے لگیں انڈین ہسٹری کانگریس کے 55 ویں سیشن منعقدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1994 میں ایک مقالہ The Kulahias (some aspects of the history and culture) کے عنوان سے پڑھا جس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ اردو میں بھی ''کلہیا برادری'' سے متعلق ان کا فکر انگیز مقالہ شائع ہوا جس میں حقائق کی پیش کش کے ساتھ (چونکہ ان کا تعلق بھی شاید اسی مہاجر آبادی سے ہے) چند اہم سوالات بھی اٹھائے گئے۔

دسمبر 1995 میں ان کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ''بونسائی'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ حیرت انگیز طور پر انھوں نے ایک سماجی حقیقت کو سائنسی سچائی کے ساتھ وابستہ کر کے جس طرح یہ کہانی لکھی اس کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد بھی ان کے کئی افسانے ملک کے اہم رسالوں میں شائع ہوئے مگر گذشتہ دس برسوں سے وہ خدا جانے کیوں بالکل خاموش ہیں۔

ثاقب عظیم آبادی

سید حسن رضا (تخلص ثاقب) ولد سید علی حسن کی پیدائش 1898 میں محلہ شاہ کی املی، پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں حاصل کی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے فاضل کی ڈگری لی اور 1922 کے قریب گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ سیٹی میں عربی کے استاد ہوگئے۔ بعد میں ایک عرصے تک پٹنہ کالجیٹ اسکول میں ہیڈ مولوی بھی رہے۔ شعروادب کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ اس لیے چودہ برس کی عمر سے ہی غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور کچھ ہی دنوں بعد میر باقر عظیم آبادی سے اصلاح لینے لگے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن پہ بھی طبع آزمائی کی اور ملک گیر پیمانے پر اپنی پہچان بنائی۔ وہ ایک دردمند دل اور دلاویز شخصیت کے مالک تھے۔ ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار'' اور ''خیر خواہانِ جہان علم وزبان'' (جلد اول) از ساحل احمد کے علاوہ کئی اور کتابوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ ان سے مشورۂ سخن کرنے والے شاگردوں میں پرویز شاہدی، مظہر امام، رمز عظیم آبادی، شکیب ایاز، تاج پیامی اور ان کے صاحبزادے سعید رضا گہر کے نام خاصے مشہور ہیں۔ 19 رجنوری 1974 کو آپ کا انتقال ہوا اور احاطہ مغل کی مسجد، شاہ کی املی، پٹنہ سیٹی میں مدفون ہوئے۔ مختلف شعرا نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔ بزرگ شاعر وادیب جناب قتیل داناپوری نے ہجری سال کے مطابق لکھا

بہر تاریخ اوندا آمد آہ ثاقب، صد آہ، حسرت ہائے

1393ھ

ثاقب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ملک کے اکثر رسالوں میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے مگر ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ فتوحہ کی خانقاہ سے دستیاب حضرت رکن الدین عشق کے دیوان کی بنیاد پر انھوں نے ایک کتاب ''یادگار عشق'' لکھی تھی جس کا مقدمہ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا تھا۔ اس کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے مگر مقدمہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتاب 1930 کے آس پاس لکھی گئی تھی۔ اس میں عشق کے ہم عصر شعرا کے علاوہ ان کے تلامذہ کا بھی تذکرہ ہے اور آخر میں تقریباً ساٹھ صفحات میں عشق کے کلام کا انتخاب (ردیف وار) ہے۔ مگر سب سے حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ عشق کے اردو اور فارسی شعروں کا دوسرے شعرا کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سے ثاقب کی تنقیدی صلاحیت کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گرچہ خود انھوں نے بے حد خاکساری کے ساتھ لکھا ہے:

> ''مجھے اپنی قسمتوں پر ناز ہے کہ اپنی کم بضاعتی کے باوجود حضرت عشق کا کلیات حاصل کرلیا اور اب اس کا انتخاب یادگار عشق کے نام سے شائع کر رہا ہوں۔ اس ناچیز تالیف کے تین باب ہیں۔ حالات زندگی، خصوصیات شاعری اور انتخاب کلام۔''

ثاقب کی ایک اور کتاب جو ادبی تاریخ کے documentation کے اعتبار سے بہت اہم ہے ''عظیم آباد کی گزشتہ ادبی محفلیں'' ہے۔ ان کا دیوان ''سرمایہ نشاط'' کے نام سے 1977 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ گرچہ اس پر بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ انھوں نے پٹنہ سے ایک رسالہ ''المصباح'' بھی جاری کیا تھا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

ثاقب عظیم آبادی کی غزلوں میں دو پہلو نمایاں ہیں۔ ایک تو کلاسیکی شاعری کے مطالعے سے حاصل کردہ فنی آراستگی اور دوسرے خود اپنی شخصیت سے وابستہ قناعت۔ وہ ایک مرد درویش کی طرح اپنی ظاہری کم مائیگی کو ہی وجہ افتخار سمجھتے ہیں اور شاید ہی کبھی حرف شکایت زبان پہ لاتے ہیں۔ خود ضبطی اور تسلیم و رضا کے جذبات ان کے اکثر اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

آئینے میں تجلی ہے آئینہ ساز کی — اپنی خودی میں دیکھ رہا ہوں خدا کو میں
دانا ملا جو خاک میں نشو ونما ہوئی — پستی پسند تھی تو بلندی ہوئی نصیب
برباد ہو کے دوش صبا پر رہے گی خاک — مٹتا نہیں ہے نام کسی خاکسار کا
مرتبہ اشک ندامت کا بیاں ہو کس سے — کھل گیا باب اجابت مجھے معلوم نہ تھا

جمیلہ خدا بخش

رضیہ خاتون نام اور جمیلہ تخلص تھا۔ سال پیدائش 1868 اور سال وفات 1921 ہے۔ خان بہادر شمس العلما کبیر الدین آپ کے والد، خدا بخش خاں (بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) ان کے شوہر اور ولی الدین خدا بخش اکلوتی اولاد تھے۔ ان کے مختصر احالات کئی کتابوں میں ملتے ہیں مگر تفصیل سے سید نعمت اللہ کی تصنیف ''تلامذہ شاد''، اور تاریخ اردو ادب ارزواز وہاب اشرفی (جلد اول) میں درج ہیں۔ اسکی بنیادی وجہ شاید یہ رہی کہ جمیلہ کے آٹھ قلمی دواوین خدا بخش لائبریری کی زینت میں اضافہ کرتے رہے مگر مدتوں ان کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران معروف افسانہ نگار اور شاعر شفیع مشہدی نے یہ سرمایہ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ ممکن ہے اب جمیلہ کی تفہیم کی ایک نئی صورت پیدا ہو۔ ان کے ''تخلص'' والد کے نام اور بعض دیگر امور سے متعلق متضاد روایتیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں سید نعمت اللہ کی مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ سید احمد اللہ ندوی اور فصیح الدین بلخی کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جمیلہ کی شعر گوئی مسلم ہے۔ آٹھ دواوین کے پانچ ہزار اشعار (تقریباً) کے علاوہ ایک مثنوی احسن المطالب فی مناقب علی ابن ابی طالب، کے قلمی نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں اور اب لائبریری نے یہ سرمایہ شائع بھی کر دیا ہے۔ ان کی بعض غیر ادبی نثری تصنیفات کے قلمی نسخے بھی لائبریری میں دستیاب ہیں اور مختلف روایتوں کی بنیاد پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاد عظیم آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل رہیں، جس کے لیے خدا بخش ہی عام طور پر وسیلہ بنے۔ بعض اشعار میں انھوں

نے اپنے پیر شاہ مرشد علی جیلانی و بغدادی اور داغ دہلوی سے بھی مشورۂ سخن کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ان سب کے باوجود پروفیسر وہاب اشرفی نے ان کی شاعرانہ کاوشوں سے متعلق جو منطقی سوالات اٹھائے ہیں(تاریخ ادب اردو جلد اول اشاعت اول،ص:439) ان کی طرف توجہ کی جانی چاہیے تاکہ انیسویں صدی کی ایک اہم شاعرہ کے امتیازات اور ادبی مقام کا تعین ہو سکے۔

جمیلہ کا جو کلام دستیاب ہے اس کی بنیاد پر یہ کہنا مشکل نہیں کہ ان کے اشعار میں سادگی، صفائی، دردمندی اور شعریت کے ساتھ ساتھ تصوف اور فارسی شاعری سے استفادے کا ثبوت موجود ہے۔ویسے بعض اشعار پیچیدہ بیانی کی بھی مثال ہیں۔نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:

ان کی مجھ تک خبر نہیں آتی
اب صبا بھی ادھر نہیں آتی
ہر طرف دیکھتا ہوں حسرت سے
تیری صورت نظر نہیں آتی
غنچے مرجھا گئے ہیں گلشن میں
کیوں نسیم سحر نہیں آتی

ساحل و دشت میں ہرگز نہ پریشاں ہوں گے
اب رہا مر کے ترے قیدیٔ زنداں ہوں گے
رنج فرقت سے چھڑایا ہمیں تو نے قاتل
ہم قیامت میں بھی شرمندۂ احساں ہوں گے

دل کو شرار آہ رسا نے جلا دیا
پہلو کو مجھ فدائی کے ویراں بنا دیا

جوہر نظامی

سید احمد حسین (قلمی نام جوہر نظامی) ابن سجاد حسین 7/ دسمبر 1913 کو دوندی بازار، پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کے امتحانات پاس کئے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد، دہلی اور لاہور میں کافی دنوں تک قیام رہا۔ کچھ دنوں تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی ملازمت کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انجمن ترقی اردو بہار کی سرگرمیوں میں تندہی سے حصہ لیتے رہے۔ 24/فروری 1990 کو وفات پائی اور احاطہ درگاہ شاہ ارزاں میں مدفون ہوئے۔

جوہر نظامی کی ادبی زندگی کا آغاز تقریباً بیس سال کی عمر میں ہوا۔ ابتدا شاعری سے کی اور سید نظیر حسین شائق عظیم آبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ شعری تخلیقات ریڈیو سے نشر ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے اہم رسائل مثلاً معارف، زمانہ کانپور، ہمایوں لاہور، سب رس حیدر آباد، ساقی دہلی اور ندیم گیا وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر لکھے گئے نثری مضامین بھی اہم رسائل و اخبارات میں چھپے۔ قیام حیدر آباد کے دوران آپ کی تصنیف ''سیرت رسولؐ اور فلسفۂ اقبال'' ادارہ شرعیہ، حیدر آباد سے منظر عام پر آئی۔ مجموعۂ کلام ''فردوس خیال'' 1979 میں پٹنہ سے

شائع ہوا جس کا انتساب جواہر لال نہرو کے نام ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ ابتدا میں اختر اورینوی کا لکھا ہوا ایک تعارف اور کیفی دہلوی، مولانا سالک لاہور، قاضی عبدالغفار، سر شیخ عبد القادر اور جوش ملیح آبادی کی آرا شریک اشاعت ہیں جن سے ان کے وسیع ادبی سروکار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سلطان آزاد کے مطابق ان کی کتابیں ''کلام جوہر نظامی''، ''جگر مراد آبادی حیات و شاعری'' اور ''یادوں کے چراغ'' بھی ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

جوہر نظامی نے شاہ الفت حسین فریاد کی دختری اولاد ہونے کے سبب ایک عرصے تک خود کو جوہر فریادی بھی لکھا ہے۔ بہر حال ان کے یہاں ذہن کی کلاسیکی آراستگی اور فنی پختگی کا بہ یک نظر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نثر میں لکھے گئے بعض مضامین ان کی ذہانت اور وسیع مطالعے کا ثبوت ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

وحشت برس رہی ہے گلستاں میں ہر طرف
ہے چاک چاک دامن صحرا ترے لیے
یہ سبزۂ لطیف، یہ بھیگی ہوئی ہوا
اک گلستاں ہے ساحل دریا ترے لیے

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
کھلے نہیں ہیں جو غنچے انھیں کھلاتا جا
تجھے قسم ہے سکوں آزما نگاہوں کی
کسی غریب کی تقدیر کو جگاتا جا
وہی نگاہ وہی اک تبسم رنگیں
چراغ انجمن یاس کو بجھاتا جا

جوہر نظامی کی ادبی خدمات کا ایک پہلو مدتوں انجمن ترقی اردو بہار سے فعال وابستگی سے عبارت ہے۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ بعض اہم اور نازک مرحلوں میں انجمن کی معاونت کی اور بہار میں اردو تحریک کو زندہ رکھا۔ ایسی خدمات کی ایک مثال میرے ذہن میں محفوظ ہے جب انھوں نے انجمن کے ملازمین اور آفس پر ہونے والے اخراجات کے لیے ایک کثیر رقم (اس زمانے کے حساب سے) نہایت خاموشی سے انجمن کو بطور قرض دی تھی۔

جابر حسین

سید جابر حسین ولد سید سیف الدین، راجگیر (ضلع نالندہ) میں 5/جون 1945 کو پیدا ہوئے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے کہ ان کے پردادا شاہ محمد ہاشم بہار حسین آبادی کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے ملتا ہے۔ ان کی شادی ستمبر 1972 میں ہوئی۔

جابر حسین نے بہار یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم-اے۔ کرنے کے بعد مونگیر کے ایک کانسٹی ٹیونٹ کالج میں درس وتدریس کی ذمہ داریاں سنبھالیں مگر ابتدا سے ہی عملی سیاست سے ان کی دلچسپی رہی اور 1974 کے جے پرکاش اندولن میں سرگرم رہنے کے سبب نہ صرف میسا میں گرفتار ہوئے بلکہ یونیورسٹی کی ملازمت سے معطلی کا دکھ بھی اُٹھانا پڑا۔ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے 1977 میں مونگیر سے بہار اسمبلی کے ممبر ہوئے اور کرپوری ٹھاکر کی وزارت میں وزیر صحت بنائے گئے۔ وزارت کے خاتمے کے بعد کچھ دنوں کالج آف کامرس پٹنہ میں انگریزی کے استاد رہے۔ اس دوران بھی سماجی وسیاسی تحریکوں میں شامل رہے۔ جون 1994' میں بہار لیجس لیٹو کاؤنسل کے ممبر نامزد کئے گئے۔ اپریل 1995 میں کاؤنسل کے ورکنگ چیرمین ہوئے اور 26/جون 1996 سے مستقل چیرمین ہوگئے۔ مئی 2000

میں دوبارہ کاؤنسل کے ممبر ہوئے اور 29 رمارچ 2006 کو راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہونے کے بعد اس عہدے کو چھوڑ دیا۔ 2012 میں اس عہدے سے سبکدوشی کے بعد حسب معمول سماجی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔

جابر حسین کی غیر ادبی مصروفیات خاصی متنوع اور قابل ستائش رہی ہیں۔ جن دنوں وہ وزیر صحت تھے، انھوں نے دیہی علاقوں میں علاج کی سہولیات فراہم کرنے پر زور دیا۔ جب وہ ایم-ایل-سی اور کاؤنسل کے چیرمین بنے تو انھوں نے بہار کے پسماندہ اور اقلیتی طبقات کے لیے خاص طور پہ کام کیا۔ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے مسائل پر توجہ دیتے ہوئے نہ صرف رپورٹیں اور سفارشات مرتب کیں بلکہ ان پر عمل درآمد کے لیے ریاستی اقلیتی کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے (1990 تا 1995) اقلیتی فلاح کی علیحدہ وزارت کے قیام کی بھی راہ ہموار کی۔ عوامی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی سروکار کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بامقصد اظہار خیال کی بھی ہمت افزائی کی اور اس طرح کی کاروائیوں کی باضابطہ روداد مرتب کی۔

ادبی ذوق وشوق جابر حسین کو وراثت میں بھی ملا ہے مگر ان کے دو امتیازات ایسے ہیں جو آسانی سے نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ ایک تو یہ کہ وہ عہد حاضر کے ان گنے چنے مصنفین میں ہیں جو اردو، ہندی اور انگریزی، تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور کم از کم ہندی اور اردو میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے دو چار سیاست دانوں میں سے ایک ہیں جنھیں زبان وادب کی خدمت کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔ یہ ایوارڈ انھیں 2005 میں ان کی کتاب ''ریت پر خیمہ'' (اردو) کے لیے ملا تھا۔ ان کا ایک اور امتیاز میرے خیال میں یہ ہے کہ انھوں نے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار کاؤنسل اور حکومت کی سرگرمیوں سے متعلق اردو میں ایک باضابطہ رسالہ ''دستاویز'' کی شکل میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو مرکز، پٹنہ کے زیر اہتمام ''اردو نامہ'' کے نام سے ایک مختصر سا ادبی اخبار جاری کیا جس کے بعض یادگار شمارے بھی شائع ہوئے۔ کاؤنسل کا ایک ''خبر نامہ'' اور ''ترجمان'' بھی اس دوران پابندی سے نکلتا رہا جب وہ چیرمین تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ''اردو مرکز'' کے زیر اہتمام بعض گوشہ گیر قسم کے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں شائع کیں اور کئی نادر مخطوطات کو مرتب کیا۔

جابر حسین شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ ان کی کتابیں اردو ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیل ''گوگل سرچ'' پر دیکھی جاسکتی ہے۔ میں یہاں ان کی منتخب اردو کتابوں کی فہرست درج کرتا ہوں:

(i) ایک ندی ریت بھری (شاعری) 1992۔ ہندی اور بنگلہ زبانوں میں بھی شائع ہوئی۔

(ii) بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں (تجزیاتی مطالعہ) 1994۔ ہندی میں بھی شائع ہوئی۔

(iii) سُن اے کاتب (کہانیاں) 1997

(iv) ریت پر خیمہ۔ (ڈائری نما افسانے) (2002)

(v) بے اماں۔ (ڈائری) 2002

(vi) (نظمیں) 2003 ہندی میں بھی شائع شدہ

اردو میں جابر حسین کی افسانہ نگاری سے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی کا مضمون مطبوعہ ''معنی سے مصافحہ'' اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کا مقالہ ''جابر حسین کی بے اماں حقیقت نگاری، (مطبوعہ سہ ماہی) آب وگل۔ دہلی) خاصا اہم ہے مگر میرا خیال ہے کہ جابر حسین کے فنی امتیازات کا چند صفحوں یا سطروں میں احاطہ کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اردو اور ہندی میں ان کی بے مثال ذہانت، روایت سے گہری وابستگی، دردمندی اور تخلیقی صلاحیت کے حوالے سے ابھی تفصیل سے لکھا جانا باقی ہے۔ انھیں صرف پروٹسٹ کا فنکار کہنا یا پسماندگان اور دلت طبقوں کا آئینہ دار قرار دینا بھی بس مطالعے کا ایک ہی رخ ہے۔ ان کے افسانوں کی ہیئت یا فارمیٹ سے متعلق جو سوالات اٹھتے رہے ہیں ان کے جواب میں بس یہ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک جینوین اور اچھا تخلیقی فنکار رسمی طرز اظہار کا پابند نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک غیر معمولی فنکار ہیں اور ایسے فنکاروں کی تفہیم کے نت نئے پہلو عہد بہ عہد سامنے آتے رہتے ہیں۔ البتہ یہ بات میرے لیے حیرت خیز بھی ہے اور تشویش انگیز بھی کہ گذشتہ کئی برسوں سے ان کی کوئی قابل ذکر تخلیقی کاوش سامنے نہیں آئی ہے۔ شاید وہ کسی بڑے ادبی شاہ کار کے اہتمام میں ہیں۔

جاوید حیات

سید محمد جاوید حیات (قلمی نام: جاوید حیات) ولد سید محمد ابوالحیات شیدا تعلیمی سند کے مطابق 11 رمئی 1957 کو موضع راجے پور تھانہ کرتھا (ضلع ارول) میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام آصفہ خاتون ہے جن کا تعلق مشہور بستی کاکو پالی اور فیروزی سے تھا۔ جاوید کے دادا سید وجاہت حسین ایک دیندار گھرانے کے فرد تھے جس کی زمینداری راجے پور کے علاوہ شہباز پور، پلاسی اور رتنی وغیرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ والد ابوالحیات شیدا خود شاعر وادیب بھی تھے اور ادب نواز بھی۔ پہلے رانچی اور پھر پٹنہ کے اے۔جی۔آفس میں ملازم رہے اور پٹنہ سے ہی Senior Audit Officer کی حیثیت سے ریٹائر کیا۔اے۔جی۔آفس پٹنہ کے تاریخ ساز مشاعروں میں ان کا بھی اہم رول ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے ایک اشاعتی ادارہ کریسنٹ پبلی کیشن کے نام سے قائم کیا تھا جس کے زیر اہتمام کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی جیسے مشاہیر کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک لوح کی صوفیانہ بے نیازی تھی جس کے سبب اپنے کلام کی اشاعت سے عام طور پر گریزاں رہے اور کوئی مجموعہ کلام بھی ترتیب نہیں دیا۔ ان کے پانچ بیٹے ہیں جن میں جاوید حیات اور خورشید حیات علم وادب سے وابستگی رکھتے ہیں۔ جاوید حیات کو اپنے والد کی بہت سی خوبیاں وراثت میں ملی ہیں۔

جاوید نے بنیادی تعلیم مولوی عبدالرزاق سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم وتربیت رانچی میں ہی ہوئی۔بی۔اے آنرس مگدھ یونیورسٹی سے او 1981 میں امتیازی نمبروں سے ایم۔اے پاس کیا۔پی ایچ۔ڈی کے لیے ڈاکٹر ممتاز احمد کی نگرانی میں 1985 میں اپنا تحقیقی مقام مکمل کیا۔دوسال ایس۔بی۔آر کالج باڑھ اور جوبلی کالج بھرکھنڈہ (ہزاری باغ) میں پڑھایا۔ 1987 میں پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت ملی جہاں بی این کالج پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچ کر اب بھی کام کررہے ہیں۔1982 میں ابوالفتح محمد طیب کی صاحبزادی بارکہ یاسمین سے شادی ہوئی۔ایک بیٹا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اور بیٹی پٹنہ میں زیر تعلیم ہے۔

جاوید حیات کی ذہنی تشکیل میں گیا کی ان ادبی محفلوں کا اہم حصہ رہا ہے جو کلام حیدری کی قائم کردہ کلچرل اکادمی میں برابر منعقد ہوا کرتی تھیں۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1985 کے آس پاس ہوا۔ان کا زیادہ تر ادبی کام اردو فکشن اور صحافت کی تاریخ وتنقید سے تعلق رکھتا ہے۔''مبادیات صحافت'' کے نام سے ایک کتاب 1995 میں منظر عام پر آچکی ہے جو بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔بہار کی اردو صحافت سے متعلق ان کا تحقیقی مقالہ زیر طبع ہے۔ایک اور کتاب ''اردو فکشن کے نئے تناظر'' بھی زیر اشاعت ہے جس میں شکیلہ اختر، حسین الحق اور اردو فکشن کے نئے تناظر کے موضوع پر لکھے گئے مضامین قابل توجہ ہیں۔ان کی زیر نگرانی تحقیقی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر بھی عام طور پہ اردو فکشن سے متعلق موضوعات پہ مقالہ لکھتے رہے ہیں۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے جاوید حیات کی دوسری اہم خدمات معیاری درسی کتابوں کی تیاری سے عبارت ہے۔انھوں نے بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن اور بہار ایجوکیشن پروجکٹ B.E.P کے لیے بہت سی کتابیں ترتیب دی ہیں جن میں سے بعض تعلیم بالغاں سے تعلق رکھتی ہیں۔نیشنل لٹریری مشن سے وابستہ رہ کر بھی وہ اردو زبان سے متعلق بنیادی نوعیت کا کام کررہے ہیں۔

اسلوب تحریر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

''مظلوم اگر کچھ کہے تو زبان کاٹ لی جاتی ہے اور چپ رہے تو ظلم سہنے کا الزام لگتا ہے۔ایسے میں وہ کیا کرے، بولے یا چپ رہے، اس کشمکش کے درمیان جھولتی پوری زندگی فرات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔فرات عمل اور ردعمل کے مسلسل اور پیچیدہ دام کی گرفتار اس زندگی کا اعلامیہ ہے جو فرات کے مانند ہے اور جس کے کنارے کھڑی تشنہ لب انسانیت کرب وبلا میں گرفتار ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔''

جنون اشرفی

احمد درویش (قلمی نام جنون اشرفی) ولد سید عبدالباری۔ تعلیمی سند کے مطابق 3 ستمبر 1942 کو گورگاواں، نزد جمال الدین چک (کھگول سے ایک کیلومیٹر پچھم) ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا جدی وطن گنو بیگہا (بیتھو شریف) ضلع گیا ہے اور سلسلۂ نسب حضرت مخدوم سید شاہ درویش سے ملتا ہے۔ ان کے والد، بی بی ولی فاطمہ ساکن گورگاواں سے شادی کے بعد اپنے سسرالی گاؤں میں ہی بس گئے تھے۔ وہ خود شاعر تھے اور عاصی تخلص کرتے تھے۔

جنون اشرفی کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں مولوی ثناءاللہ کے علاوہ خود ان کے والد نے بھی حصہ لیا۔ تقسیم وطن کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات کے بعد یہ خاندان کھگول میں آکر آباد ہو گیا۔ یہیں کے ریلوے ہائی اسکول سے احمد درویش نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر بی۔ ایس کالج دانا پور سے آئی۔ اے اور بی۔ این کالج پٹنہ سے 1963 میں بی۔ اے (اردو آنرز) پاس کرنے کے بعد 1965 سے سول ڈیفینس اکاڈمنس پٹنہ میں آڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگے۔ جہاں ترقی کرتے ہوئے ستمبر 2002 میں اسسٹنٹ اکاؤنٹس افسر کے عہدے تک پہنچ کر سبک دوش ہوئے۔ فی الحال اپنی شریک حیات بی بی سائرہ اور بیٹوں حسن احمد، برق احمد، فضیل احمد اور فیصل درویش کے ساتھ ایف۔ سی۔ آئی روڈ پھلواری شریف میں قیام پذیر ہیں۔

جنون اشرفی بہار اور بیرون بہار کے مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے ہیں اور ان کا کلام بھی مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ 2006 میں ان کا ایک شعری مجموعہ ''شجر خزاں رسیدہ'' حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے منظر عام پر آچکا ہے۔ اپنے ذوق سخن سے متعلق خود ان کا بیان ہے:

> ''میرے والد محترم سید عبدالباری اشرفی خود شاعر تھے۔ ان کے ساتھ بچپن مشاعروں میں جایا کرتا تھا۔ اسی وقت سے شاعری سے ذوق پیدا ہوا۔ 1960 سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔ حضرت منظور تسکین سے جو حضرت حمید عظیم آبادی کے شاگردوں میں تھے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جب 1986 میں ان کا انتقال ہوگیا تو حفیظ نواب دانش کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوگیا۔ ادھر میرا تبادلہ پٹنہ سے کلکتہ ہوگیا۔ جناب قیصر شمیم سے اصلاح سخن کرانے لگا۔ جب وہاں سے تبادلہ آسام ہوگیا تو یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا''۔

واقعہ یہ ہے کہ جنون اشرفی کے کلام پر ان بزرگوں کے اثرات بہت کم دکھائی دیتے ہیں جن کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اردو غزل کی کلاسیکی روایات سے آشنائی ان بزرگوں کی رہنمائی کا نتیجہ ہو مگر اپنے موضوعات و احساسات کو انھوں نے جس طرز خاص سے پیش کیا ہے وہ ان کی اپنی پہچان کے لیے کافی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار نقل کر رہا ہوں۔

اب کہاں جا کر بنائیں گے پرندے آشیاں
شہر ہی کیا جنگلوں کے بھی شجر کٹنے لگے

ہر سمت ہواؤں کی ہے آشوب نوائی
ہم شہر تمازت میں اماں لائیں کہاں سے

مدت سے نہیں آنکھ میں خوابوں کا گزر بھی
احساس کا ویران کھنڈر دیکھ رہا ہوں

سہولتیں بھی مجھے ہیں نصیب راحت بھی
خدا کرے کہ ملے تھوڑی سی مسرت بھی

ہوا میں قتل تو الزام خودکشی آیا
اسے پسند نہ آئی مری شہادت بھی

یہی نہیں کہ زمانہ خلاف تھا میرے
مری حریف رہی خود مری صداقت بھی

لہو میں صوت و صدا کا چراغ جل نہ سکا
بجھی بجھی سی رہی کچھ مری سماعت بھی

حامد عظیم آبادی

سید شاہ حامد حسین ابن سید واجد حسین مختلف روایتوں کے مطابق 24 ربیع الاول 1300ھ (بمطابق 1882) کو عظیم آباد کے محلہ درگاہ شاہ ارزاں میں پیدا ہوئے۔ بعض مورخین نے سال پیدائش 1301ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ بچپن کا زمانہ نہایت عیش و آرام سے گزرا چونکہ یہ خانوادہ مال و دولت اور عزت و شہرت کے اعتبار سے پٹنہ کے گنے چنے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی وہ ترک دنیا کی طرف مائل ہو گئے اور صرف سولہ برس کی عمر میں شاہ حیدر علی کے جانشیں منتخب ہو کر درگاہ شاہ ارزانی کے سجادہ نشیں ہو گئے۔ اس کے بعد درگاہ کی روایت کے مطابق نہ درگاہ کی حدود سے باہر قدم نکالا نہ شادی کی۔ گوشہ نشینی کے سبب روایتی انداز کی تعلیم بھی طبابت اور ہومیو پیتھک کے درس تک محدود رہی۔ 17 ستمبر 1967 (مطابق 11 جمادی الثانی 1387ھ) مختصری علالت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ احاطہ درگاہ شاہ ارزانی کے باہر درگاہ اور مسجد کے درمیان سپرد خاک ہوئے۔ عبدالودود شمس مظفر پوری نے قطعۂ تاریخ لکھا۔

شاہ حامد نے پیا رحمت کا جام　　جانشین شاہ ارزاں نیک نام
شمس نے یوں کہہ دیا سال وفات　　صاحب سجادہ تھے "ذو الاحترام"

1387ھ

حامد عظیم آبادی کو شعروادب کا شوق وراثت میں ملا تھا۔ ماحول بھی سازگار تھا۔ اس لیے حامد نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ ابتدا میں خواجہ شہرت عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ اس کے بعد داغ اور احسن مارہروی سے اصلاح لیتے رہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی نے جو ''دیوان حامد'' مطبوعہ 1979 (بہار اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے اشاعت شدہ) کے مرتب بھی ہیں۔ اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

> ''شاہ حامد حسین ...داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ داغ کے انتقال کے بعد انھوں نے داغ کے شاگرد احسن مارہروی سے بھی تلمذ کی عزت حاصل کی۔ لیکن کچھ تو مزاجاً صوفی ہونے کی وجہ سے اور کچھ دبستانِ عظیم آباد کے شاعر ہونے کی حیثیت سے داغ کی شوخی اور معاملہ بندی کو اپنے تغزل میں اتار نہ سکے۔ ان کے دیوان کا جو قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ انھوں نے غزلیت کو معرفت کی شراب حقیقی میں ڈبو کر اس میں معنوی تاثیر پیدا کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔''

یہ رائے اپنی جگہ بے حد جامع ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ حامد عظیم آبادی کو ادبی دنیا میں وہ مقام نہیں حاصل ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ ویسے تو ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی دنیائے علم و ادب کی اہم شخصیتوں نے جن میں سائل دہلوی، نوح ناروی، ضیا لکھنوی، کوثر خیر آبادی، علامہ جمیل مظہری، فضل حق آزاد اور اعظم کریوی کے نام بھی آتے ہیں، انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ ان کی کتابیں ''کتاب المیلاد'' (2001) افسانۂ شہادت، مرقع شہادت زمزمۂ شہادت اور گلدستہ سلام (نوحوں، سرمیوں اور سلام کا مجموعہ) کی اشاعت بھی ہوئی اور ان کی حیات وخدمات سے متعلق ویر کنور سنگھ یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا گیا مگر ان کی ادبی خدمات کے مختلف پہلو اب بھی تفہیم سے محروم ہیں۔ ان کی غزلوں میں جو خیالات کا تسلسل ہے، بے تکلفی اور سادگی کی فضا ہے اور مادی لاگ لپٹ کی جگہ جو رومانیت ہے وہ شاید دبستان عظیم آباد کے بزرگوں کی صحبت کا فیضان ہے۔ ویسے ان کی قادر الکلامی اپنی جگہ مسلّم ہے اور ادبی جلسوں اور مشاعروں کا تواتر کے ساتھ انعقاد کر کے انھوں نے عظیم آباد میں شعروادب کی جو خدمت کی ہے وہ بھی ادبی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر صرف چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ ویسے انھوں نے بعض زمینوں میں پچاس پچاس اشعار کی غزلیں کہی ہیں۔

خزاں کا دور بھی اک عالمِ ہُو کا زمانہ تھا
نہ شاخِ گل پہ بلبل تھی نہ کوئی آشیانہ تھا

کبھی بلوایا اپنے گھر کبھی گھر آپ کے پہنچے
ہمارا ملنا جلنا آپ سے سب مخلصانہ تھا

کبھی ہم کو بلا بھیجا کبھی خود تم چلے آئے
تمھارا بھی رویہ ہم سے کتنا دوستانہ تھا

کوئے جاناں کی جبیں پر جو مرا سر ہوتا
مرتبہ عرش نشینوں کے برابر ہوتا

مری فریاد تو بیکار نہ جاتی یارب
تو ہی سنتا کہیں سیدھا جو مقدر ہوتا

تیری رحمت مری حامی جو نہ ہوتی یارب
عملِ نیک بھی عصیاں کے برابر ہوتا

حامد علی خاں

محمد حامد علی خاں ولد محمد محمود حسن خاں تعلیمی سند کے مطابق یکم جولائی 1961 کو بہار شریف (موجودہ ضلع نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملک کے معروف تعلیمی ادارے پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے گریجویٹ تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ہومیوپیتھک میڈیسن کی تعلیم شروع کی تھی مگر جلد ہی اکسائز انسپکٹر کی ملازمت مل گئی جہاں سے 1959 میں سبک دوش ہو کر بہار شریف میں 11/اپریل 1989 کو وفات پائی۔ دراصل یہ آبائی زمینداروں کا گھرانہ تھا جس کی زمینداری بہار شریف سے چھ سات میل دکھن موضع ''گلتی'' میں واقع تھی۔ مگر خاندان میں علم وادب کا بھی سلسلہ تھا اور مختلف افراد حصول تعلیم کے بعد اہم عہدوں پہ فائز ہوتے رہے تھے۔ اسی ماحول میں حامد علی خاں کی ذہنی تربیت ہوئی اور انھوں نے ایم۔اے (اردو وفارسی) تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی۔ایڈ کیا اور قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد جولائی 1991 سے اگست 1993 تک شہرۂ آفاق خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں سینیر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر یکم ستمبر 1993 سے تین برسوں تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے بہار یونیورسٹی میں کام کرتے رہے۔ نومبر 1996 سے اسی یونیورسٹی میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کی سفارش پر آر۔این کالج حاجی پور میں اسی عہدے پر کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حامد علی خاں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ اور غزل کی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اس طرح کے اشعار کہے جن پر اقبال کے اثرات نمایاں ہیں مثلاً:

نہ جانے کون سا منظر خوش آئے چشم آدم کو　　نظر لگ جائے پھر کس شعلہ روئے شبنم کو
نتائج آشنا تیری نظر غافل رہی خود سے　　نہ رکھا تو نے سینے سے لگا کر درد پیہم کو
فغان نیم شب تیری بنے باد سحرگاہی　　ضرورت ہے ترے انفاس کے شعلے کی شبنم کو

یہ رنگ سخن اپنے آپ میں منفرد تھا مگر حامد علی خاں اپنے والد محترم کے مشورے پر جلد ہی نثر نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ بہار میں اردو کی نئی ادبی نسل کو ایک محنتی اور ذہین نثر نگار میسر آ گیا۔

حامد کے ادبی مقالے ملک کے بیشتر معیاری رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ خاص طور پہ فکشن سے متعلق ان کی تحریروں میں تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ تحقیقی کد و کاوش نمایاں ہے۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کے لیے صباح الدین عبدالرحمٰن اور عبدالغفور نساخ سے متعلق جو مونوگراف لکھے ہیں ان میں بھی یہ صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ گوپی چند نارنگ سے متعلق ان کی کتاب بھی خاصی مبسوط اور بھرپور ہے۔ مختلف ادبی تحریروں کے لیے انھیں دہلی اردو اکادمی بہار اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی، دہلی سے انعامات مل چکے ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کی ایک مختصر فہرست بہ اعتبار سن اشاعت درج ذیل ہے:

مظفر پور: علمی ادبی اور ثقافتی مرکز (1988)۔
اصناف سخن و مشاہیر شعرائے فارسی (1992)
بھگوتی چرن درما (ہندی مونوگراف کا اردو ترجمہ 1993)
گوپی چند نارنگ: حیات و خدمات (1995)
کبوتروں کی پرواز (رسکن بانڈ کے ناول The flight of Pigeon کا اردو ترجمہ 1996)
صباح الدین عبدالرحمٰن (مونوگراف 1996)
کہانی جواہر لال کی (ہندی سے ترجمہ 2001)
عبدالغفور النساخ (مونوگراف 2003)
اردو کے اٹھارہ ناول (2008)

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت مختلف نوع کے ادبی کاموں میں مشغول رہے ہیں۔ انھوں نے بعض نصابی کتابیں بھی ترتیب دی ہیں اور ان سے مزید بہتر کتابوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔

خواجہ افضل امام

خواجہ افضل امام ولد خواجہ فضل امام مستند روایتوں کے مطابق 3 ستمبر 1924 (یہ تاریخ تعلیمی سند میں نہیں ہے) کو پھلواری شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے پھوپھا مولانا تمنا عمادی اور ان کی زوجہ عزیز الفاطمہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ 1943 میں کھگول ریلوے اسکول (داناپور) سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ انٹر اور بی۔اے۔ کے امتحانات میں بی۔این کالج، پٹنہ سے کامیابی حاصل کی۔ ایم۔اے۔ فارسی (قدیم) اور ایم۔اے۔ فارسی (جدید) کے امتحانات پٹنہ یونیورسٹی سے پاس کیے اور ''حیات وکلام سلیم طہرانی'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر 1959 میں پی ایچ۔ڈی کی سند پائی۔ اسی دوران تقریباً آٹھ برسوں تک پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں شعبۂ مخطوطات (Manuscript Section) کے مہتمم رہے۔ ساتھ ہی مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ یونیورسٹی میں پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1965 سے بی۔این کالج پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریگولر فارسی لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ وہاں سے چند برسوں کے بعد پٹنہ کالج میں تبادلہ ہوگیا۔ یہیں سے 1990 میں صدر شعبۂ فارسی کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوگئے۔ بی بی نبی فاطمہ دختر داروغہ سعادت حسین، پھلواری شریف سے شادی ہوئی تھی جس کے سبب پھلواری شریف سے ہمیشہ دلی لگاؤ رہا۔ ویسے بقول محمد ابرار

قاسمی (مقالہ: پروفیسر خواجہ افضل امام: کچھ یادیں، مطبوعہ قومی تنظیم، پٹنہ 12/اکتوبر 2006) انکا نسبی رشتہ تقریباً ہر مسلک کے امیر اور سجادہ نشینوں سے تھا جسے دونوں ہی جانب سے نبھایا جاتا رہا۔ 18/رمضان المبارک 1437ھ بمطابق 12/اکتوبر 2006 کو پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔

خواجہ افضل امام مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ صوم وصلوۃ کی پابندی، خوش اخلاقی اور مہمان نوازی ان کی شخصیت کے نمایاں اجزا تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا اور قدیم واقعات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے سیکڑوں اشعار انھیں یاد تھے جن کا وہ مختلف مواقع پر برجستہ استعمال کیا کرتے تھے۔ انھوں نے خود بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے مگر ان کی اشاعت سے بے پروا رہے۔ ان کی تمام تر مطبوعہ تصانیف کا تعلق تحقیق وتنقید سے ہے۔ گرچہ کئی تصانیف غیر مطبوعہ بھی ہیں مگر مطبوعہ کتابوں کی مختصر سی فہرست درج ذیل ہے:

دیوان فارسی نذیر الحق فائز پھلواروی (تدوین)	1964
مضامین افضل (مجموعہ مضامین)	2001
آئینہ شعرائے بہار	2002
نسب نامہ خواجگان موضع جانی پور ضلع پٹنہ	2003
حیات وکارنامے علی قلی سلیم طہرانی (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی	

نمونہ کلام کے طور پہ اردو کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

مجھ کو پیری نے دکھایا بزم مرقع میرا — خود مجھے کہنا پڑا یہ مری تصویر نہیں

کچھ دنوں اور رہیں اہل محلہ بے چین — نہ سنے گا کوئی نالوں کی صدا میرے بعد

خورشید اکبر

محمد خورشید عالم انصاری ابن محمد زین العابدین انصاری بہ اعتبار سند 14/جولائی 1959 کو موضع ملکی چک، بریگہا (شیخ پورہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں (1985 تک) خورشید درخشاں کے نام سے لکھتے رہے۔ بعد میں قلمی نام خورشید اکبر اختیار کیا۔ دادیہال بڈھیا (لکھی سرائے) اور ننیہال خواجہ لاہوری بیگہ استھانواں (ضلع نالندہ) ہے۔ والد انڈین شپنگ کمپنی میں کلکتہ پورٹ پر ملازم اور ٹریڈ یونین لیڈر تھے جن کا جون 1986 میں انتقال ہوا۔

خورشید نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا حافظ محمد نصیر الدین سے حاصل کی۔ ہائی اسکول بریگہہ سے 1974 میں میٹرک پاس کیا۔ بھاگلپور یونیورسٹی سے سیاسیات اور بہار یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد 1993 سے بہار ایڈمنسٹریٹو سروس جوائن کرلی جس سے اب تک وابستہ ہیں۔

خورشید اکبر کی انتظامی مشغولیات ان کی ادبی سرگرمیوں کے لیے کبھی رکاوٹ نہیں بن پائیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن پہ طبع آزمائی کی اور نثر نگاری میں بھی اپنے منفرد تنقیدی رویے کا اظہار کیا۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے 'سمندر خلاف رہتا ہے' (1994)، 'بدن کشتی بھنور، خواہش' (2002) اور 'فلک پہلو میں' (2008) منظر عام پہ آچکے ہیں۔ نثر میں ایک کتاب ''ایک بھاشا و لکھاوٹ، دو ادب: تنقیدی تجزیہ'' کے نام سے 2007 میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے جو

گیان چند جین کے اردو دشمن رویے کا مدلل جواب ہے۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں بہار اردو اکادمی ایوارڈ بھارتیہ ساہتیہ کار سنسد سمتی پور کی جانب سے اختر الایمان ایوارڈ اور نوشکتی نکیتن پٹنہ کی جانب سے 2007 میں 'ساہتیہ سادھنا سمان'' کا اعزاز مل چکا ہے۔ آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کے بعد وہ 2007 میں بزم اردو، قطر کی جانب سے منعقدہ بین الاقوامی ذوق سمینار اور مشاعرے میں بھی شرکت کر چکے ہیں۔

خورشید اکبر کی غزلوں میں فکر کی وسعت اور اسلوب کی تازہ کاری کا بیک نظر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل گوئی کے حوالے سے پروفیسر وہاب اشرفی کی یہ رائے وقیع ہے:

''ان کے یہاں زبان و بیان کو روایت سے الگ کرنے کی ایک سوچی سمجھی فکر اور تدبیر ملتی ہے۔ یہ تدبیر کافی مطالعہ اور ہنرمندی کا تقاضہ کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ خورشید اکبر نے اپنے آپ کو بھیڑ سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس سعی میں وہ بے حد کامیاب نظر آتے ہیں..... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمومیت کو کبھی بھی اپنے مزاج کا حصہ بنانا نہیں چاہتے۔ اس عمل میں کہ عمومی رویہ ان کے کلام میں بار نہ پا جائے کبھی کبھی وہ کھردرے اسلوب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں لیکن یہ کھردرا پن شاعر کی تخلیقی وژن کی وجہ سے ایک نئی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور ایک نئے آہنگ سے ہم روشناس ہو جاتے ہیں۔''

خورشید اکبر کے درج ذیل اشعار ان کے منفرد تخلیقی رویے کی خبر دیتے ہیں:

خیر و شر تیری پناہوں میں خدا — تو ہی نغموں تو ہی آہوں میں خدا
تو نظر کے مے کدے کی روشنی — تو ہی دل کی خانقاہوں میں خدا
شہہ رگوں میں موجزن تیری انا — تیرا نشہ کج کلاہوں میں خدا
العطش میں تو ہے دریا میں بھی تو — تو ہی کربل کی سپاہوں میں خدا

فلک سے آہ مقدر سے ہے زیادہ کیا — سفینہ شہر سمندر سے ہے زیادہ کیا
وہ ایک آئینہ چہرے کی بات کرتا ہے — وہ ایک آئینہ پتھر سے ہے زیادہ کیا
جو دن ہے خاک بیاباں جو رات ہے جنگل — وہ بے پناہ سرے گھر سے ہے زیادہ کیا

بدن کی راکھ سے روشن شرارہ کر کے دیکھوں گا
میں اپنی جان کو اب کے ستارہ کر کے دیکھوں گا

بدن کشتی بھنور خواہش، ارادہ بادباں جیسا
جنوں دریا، چلو! خود کو کنارہ کر کے دیکھوں گا

یہ سوچا ہے لب لرزاں پہ رکھ کر تشنگی ساری
تجھے بھی اے سمندر! استعارہ کر کے دیکھوں گا

سفر میں خیر و شر کے بعد وہ منزل بھی آئے گی
جہاں خورشید اپنا گوشوارہ کر کے دیکھوں گا

زمیں پہنی گئی اور آسماں اوڑھا گیا برسوں
بدن کی خانقاہوں میں خدا سویا رہا برسوں

آتے آتے آئے گی دنیاداری
جاتے جاتے فاقہ مستی جائے گی

خالد عبادی

محمد خالد ابن محمد عباد اللہ (دربھنگہ) تعلیمی سند کے مطابق 12/ جنوری 1971 کو پیدا ہوئے۔ مگر وہ مصنف کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری تاریخ پیدائش 3/دسمبر 1966 ہے۔ میرے پاپا کی مصلحت کہ انھوں نے فوقانیہ کا فارم بھرتے ہوئے نہ صرف سال میں تبدیلی کردی بلکہ مہینہ بھی کچھ کا کچھ کردیا... میں دنیا کو جو ہوں اور جیسا ہوں وہی نظر آنا چاہتا ہوں...''

خالد نے فوقانیہ تک ابتدائی تعلیم مدرسہ حمیدیہ چھپرہ سے حاصل کی۔ انٹر میں داخلہ لیا۔ اور 91-1990 میں اردو ایم-اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تلاش معاش میں سرگرم ہوگئے۔ والد کے نام کی مناسبت سے خود کو خالد عبادی لکھتے ہیں مگر پہلی نظم ''اہل وطن کے نام'' روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ میں (1986) فہیم نادر کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ دنوں بہار اردو اکادمی کے ترجمان ''زبان وادب'' کے مدیر رہے۔ پھر دہلی کے چند اخبارات ورسائل میں کام کیا۔ ان دنوں روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' (پٹنہ ایڈیشن) سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ آزادانہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ دراصل تحفظات اور تعصبات سے بے نیازی کے ساتھ ایک نوع کی آزاد خیالی ہی ان کا امتیاز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی ان کے لیے

پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی اور شاہراہ حیات پہ چلتے ہوئے آبلہ پائی بارہا ان کے حصے میں آئی ہے مگر اس کے باوجود وہ افسردہ ضرور ہوئے، فرسٹریشن کا شکار کبھی نہیں بنے۔ اور یہ افسردگی بھی اس لیے کہ اپنی حق گوئی کے ساتھ زندگی کو انھوں نے جس روپ میں دیکھنا چاہا، اس روپ میں وہ کبھی نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ جو مجموعی صورت حال ان امور سے پیدا ہو سکتی ہے وہ طنز یا خندہ زنی کی ایک کیفیت ہے اور اس کا مشاہدہ خالد عبادی کے اشعار میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ رہی بات کہ ان کا لہجہ کبھی کبھی تیز و تند ہو جاتا ہے اور بقول وہاب اشرفی اگر وہ خود کو Contain کر سکتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ میں ایک حد تک اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں مگر یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں خود ضبطی کی صورت نمایاں ہوتی جا رہی ہے اور ان کے تجربات میں تنوع بھی نظر آ رہا ہے جو ان کے بہتر مستقبل کا اشاریہ ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

1. نہروں کا جال (غزلیں اور آزاد نظمیں) 1997
2. خوش اجگار (غزلیں۔ معرا اور پابند نظمیں) 2006

نمونہ کلام درج ذیل ہے:

یہ بندگی بھی نہیں ردِّ بندگی بھی نہیں
دعا کو ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے

یہی بہت ہے ملا خاک میں نہ عزم سفر
سرائے دور کہیں راہ میں کنواں بھی نہیں

ندامتوں نے کشادہ کیا سواد سحر
تو اب خیال شب ماہ و کہکشاں بھی نہیں

میں خوش نہیں ہوں فلک بوس معبدوں سے ابھی
دعا کرو کہ مجھے بھی کہیں مکان ملے

ہوا میں آ گئی ہلچل کہاں سے
یہ خود کو کون لہرانے لگا ہے

اس دشت میں پانی کا طلبگار بنے کون
اے ابن علی تیرا نمک خوار بنے کون

یہ میرا وطن میرا چمن میرا بدن ہے
اب اس کے لیے چشم گہربار بنے کون

ذکی الحق

محمد ذکی الحق ابن مولوی محمد رضی الحق تعلیمی سند کے اعتبار سے 11 رجنوری 1920ء کو کمہار پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ بی-اے- آنرز فارسی (1942) ایم-اے فارسی (1944) اور ایم-اے اردو (1948) کے علاوہ بی-ایل (1948) کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1949 سے بی-این کالج پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ''غزلیات میر حسن'' پر تحقیق کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی-لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1980 میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی مختلف طرح کے علمی و ادبی اور سماجی کاموں میں مشغول رہے۔ طویل علالت کے بعد 9 راگست 1986 کو انتقال ہوا اور شاہ گنج قبرستان پٹنہ میں مدفون ہوئے۔ ذکی الحق کی ادبی زندگی کا آغاز 1936 (بقول سلطان آزاد) سے ہوا۔ انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل اور ریڈیو کے لیے تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ مختلف اصناف سخن پہ بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی بیشتر تخلیقات اپنے عہد کے اہم رسالوں جیسے ندیم، ادب لطیف اور سہیل وغیرہ میں شائع ہوئیں جن کے سبب ناقدین کی نگاہیں ان پر ٹھہریں مگر اب ان تحریروں کا یکجا کرنا بہت مشکل ہے۔ چونکہ ان کے وارثین اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ محمد ذکی الحق کی زندگی میں ہیں ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔

1۔ مطالعہ آزاد (علامہ فضل حق سے متعلق مضامین کا ترتیب شدہ مجموعہ مع مقدمہ)

2۔ ذکر و مطالعہ (ادبی مضامین کا مجموعہ) باراول مئی 1959 کتاب منزل پٹنہ۔

ذکی الحق کی صرف ایک ہی کتاب ''ذکر و مطالعہ'' ان کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہے اور اب تک اس کے مضامین مختلف مقالوں میں حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا تعارف پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے اور سید مسعود حسن رضی ادیب، نجیب اشرف ندوی، مختار الدین احمد اور شمس منیری جیسے مشاہیر اردو کی آرا کتاب کے فلیپ پر موجود ہیں۔ کتاب کا سب سے اہم حصہ ''بارہ ماسوں'' سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ اردو میں بارہ ماسہ کی فنی صورت، ابتدا اور ارتقا سے متعلق غالباً یہ پہلا مضمون ہے جس میں ایک ایک ماہر محقق اور نقاد دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بہار کے مرثیہ گو شعرا عبدالغفور شہباز اور شاد کی قطعات نگاری سے متعلق مضامین بھی تحقیق کا عمدہ نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد ذکی الحق بنیادی طور پر ایک محقق کی شکل میں اپنی شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد فضل حق آزاد، تذکرہ نگاری یا پروفیسر کلیم الدین احمد سے متعلق ان کے جو مضامین سامنے آئے ہیں ان میں بھی تحقیق کا عنصر نمایاں ہے۔ موصوف کی مزید تحریروں کی تلاش و اشاعت بہار کی ادبی دنیا پہ قرض ہے۔ مگر خدا ہی جانے یہ قرض ادا بھی ہوگا یا نہیں۔

میں ان کی ایک نظم ''جشن کلیم'' مطبوعہ ''حیات کلیم'' مرتبہ سید محمد حسنین فروری 1977 سے چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے زبان و بیان پر ان کی گرفت اور قادرالکلامی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

فروزاں ز حسنِ کلیم
درخشاں ز جشن کلیم
شدہ صرف عمر عزیز بہ اصلاح طرز قدیم
نگہبان شعر و سخن شدہ او بہ فکر سلیم
نشستہ بہ گنج ادب نوشتہ کتاب ضخیم
شدہ منکشف اے ندیم
مضامین جشن کلیم

1394ھ

رامیشور پرشاد گلوارا

رامیشور پرشاد گلوارا ولد بشوناتھ پرساد کے ابتدائی احوال زندگی جناب فصیح الدین بلخی نے یاران میکدہ از محمود علی خاں صبا کے حوالے سے نقل کیے ہیں جو خود ان کی زبان میں کچھ اس طرح ہیں:

''میں اپنے جدی مکان گلوارا ہاؤس واقع محلہ مچھر ہٹہ پٹنہ سیٹی میں 12/مارچ 1909 کو پیدا ہوا۔ میرے بابو جی شری بشوناتھ پرشاد عرف بسو بابو آنجہانی ایک کامیاب تاجر تھے مگر زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مجھ کو انگریزی تعلیم دینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ 1924 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بابو جی کی دلی خواہش کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے بی۔اے اور وکالت کی ڈگریاں بھی حاصل کیں اور 1931 میں پٹنہ ڈسٹرکٹ بار میں وکالت شروع کر دی۔ بابو جی کی ضعیفی اور علالت کی وجہ کر مجھ کو پھر اپنے آبائی پیشہ تجارت کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور اس وقت ذریعہ معاش تجارت ہی ہے۔ پبلک کی سیوا کرنے کا جو جذبہ میرے دل میں تھا اس کو بروئے کار لانے کا موقع مجھ کو مل گیا۔ چنانچہ 1941 میں پہلی بار پٹنہ میونسپلٹی کا کمشنر منتخب ہوا اور 1942 کے عام انتخاب میں بلا مقابلہ میونسپل کمشنر منتخب ہوا۔ اسی سال حکومت نے مجھ کو آنریری مجسٹریٹ نامزد کیا اور آج تک اسی عہدہ پر بحیثیت فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کام کر رہا ہوں۔

1955 میں کارپوریشن کا پہلا ڈپٹی میئر مقرر ہوا اور تین سال سے برابر ڈپٹی میئر منتخب ہوتا چلا آرہا ہوں۔ میرے گھر والوں کی زبان عرصہ سے اردو ہے اور میں نے بھی اردو مضمون لے کر بی۔اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی ترنگ اٹھتی ہے تو کچھ شعر کہہ لیتا ہوں"۔

رامیشور پرساد گلوارائے بعد میں بھی ادب کے ساتھ ساتھ سیاست سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ پٹنہ نگر نگم کے میئر ہوئے اور پٹنہ سیٹی کے اسمبلی حلقے سے ایم۔ایل۔اے کا انتخاب لڑا۔ 1978 میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی یادگار کے طور پر ایک مجسمہ پٹنہ سیٹی میں نصب ہے۔ ان کے بیٹے پٹنہ کے مشہور ڈاکٹروں میں ہیں۔

شاعری میں انھوں نے زار عظیم آبادی سے اصلاح لی مگر ان کی وفات کے بعد آزادانہ مشق سخن کرنے لگے۔ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ غالباً شائع نہیں ہوا ہے مگر گلدستوں، رسالوں اور منتخب غزلوں کے مجموعے میں ان کا خاصا کلام دستیاب ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی رنگ سخن کے پختہ مشق شاعر تھے۔

جو غزلیں فصیح الدین بلخی نے نقل کی ہیں ان کے مطلعے پیش کرتا ہوں:

تم رنگ دیکھنا دل دیوانہ دار کا
بس منتظر ہوں آمد فصل بہار کا

زمیں بھی مجھ سے خفا ہے خوش آسماں بھی نہیں
مرے لیے تو کوئی گوشۂ اماں بھی نہیں

مجھے ہے نالہ و آہ و فغاں سے کام ابھی
زبان شوق نہ لے خوش دلی کا نام ابھی

گل چاہیے نہ گلشن و ویرانہ چاہیے
رندوں کو ایک محفل رندانہ چاہیے

رضوان احمد

رضوان احمد خاں ولد حکیم مشتاق احمد غبار بھٹی کی تاریخ پیدائش 9/ ستمبر 1947 ہے۔ آبائی وطن ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) کا قصبہ موئی تھا۔ ان کے والد ''ہمدرد'' کی ملازمت کے سلسلے میں پٹنہ آئے اور مستقل طور پر یہیں آباد ہو گئے جہاں 12 رفروری 1986 کو ان کا انتقال ہوا۔ رضوان احمد نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو) کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر نواب کریم کی نگرانی میں ''آزادی کے بعد اردو صحافت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی-ایچ-ڈی کی سند حاصل کی۔ انھیں لڑکپن سے ہی ادبی ماحول میسّر تھا چونکہ والد بزرگوار خود بھی اچھے شاعر تھے۔ شاید اسی لیے طالب علمی کے زمانہ سے ہی وہ کسی نہ کسی طور پر اردو صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ 1968 میں جب پٹنہ سے ہفتہ وار 'مسائل' کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کی مجلس ادارت میں رضوان احمد کا نام بھی تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ماہنامہ ''زیور'' نکالا جو بہت جلد خواتین کا ایک مقبول رسالہ بن گیا۔ اس دوران ان کا ہفتہ وار اخبار ''عظیم آباد اکسپریس'' بھی منظر عام پر آیا جو اپنے بے لاگ سیاسی و سماجی اور ادبی تبصروں کے لیے خاصا متنازع بھی رہا اور مشہور بھی۔ دوسرے رسالوں کے لیے بھی وہ سیاسی و سماجی موضوعات پر مضامین اور کالم لکھتے رہے جن میں خاص طور پر ان کا کالم ''مجھے بولنے دو'' بہت مشہور ہوا۔ ایک عرصے تک

روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ میں بھی کالم نویس رہے اور زندگی کے آخری چند برسوں میں 'وائس آف امریکہ' کی اردو سروس سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ دنوں تک سچ پرکاش یونیورسٹی کے ایک کونسٹی ٹوینٹ کالج میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے مگر یہ ملازمت انھیں پسند نہیں آئی۔ 2010 کے اوائل میں ان کے جواں عمر بیٹے کا اچانک انتقال ہو گیا جس کے سبب وہ بے چین اور بیمار رہنے لگے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں اس سال کے اواخر میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو انھوں نے بیماری سے نجات کی دعا کرنے کی درخواست کی۔ میں نے واپسی کے بعد ان سے کئی بار ملاقات کی مگر وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ اور بالآخر 31 رمئی 2011 کو اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی دن بعد نماز عشاء شاہ گنج قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

رضوان احمد کی ادبی خدمات کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے بانیوں میں تھے اور 1976 میں اس کے تنظیمی سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔ تقریباً چھ برسوں تک بہار اردو اکادمی کے سکریٹری رہے اور اردو مشاورتی کمیٹی حکومت بہار کے وائس چیرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ہر جگہ انھوں نے بڑی خاموشی سے اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ ان کی خدمات کا دوسرا پہلو ان کی صحافتی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ لکھنے میں وہ بے حد بے باک تھے مگر ذاتی مراسم برقرار رکھنے کا ہنر بھی انھیں آتا تھا۔ اور پھر Last but not least کے طور پر ان کی افسانہ نگاری ہے جو بعض انفرادی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ فنی اعتبار سے بے حد جامع افسانے لکھتے ہیں جن کا فکر کی جدت اور نیرنگی کے باوجود ابہام سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انھیں استعاروں اور علامتوں کے استعمال سے گریز نہیں مگر استعارے واضح ہیں اور ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں ادبی وصحافتی خدمات کے لیے ''غالب ایوارڈ'' بھی ملا تھا۔ رضوان احمد کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں:-

یونان کی شہزادی (بچوں کے لیے) 1968

مسدود راہوں کے مسافر (افسانوی مجموعہ) 1977۔ اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ

فصیل شب (افسانوی مجموعہ) 1984 — اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ

کن فیکون (افسانوی مجموعہ) 1997

آسامی ناول کا ترجمہ برائے نیشنل بک ٹرسٹ - بادل چھٹ گئے۔ 1979

ریاض عظیم آبادی

سید ریاض الدین (قلمی نام ریاض عظیم آبادی) ولد سید شاہ ضیاء الدین تعلیمی سند کے مطابق 4/جنوری 1951 پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دادا سید شاہ علیم الدین کو پاسنگھاڑا (ضلع پٹنہ) کے زمیندار تھے اور خانوادے کا سلسلہ مشہور صوفی حضرت نوشہ توحید (بہار شریف) سے ملتا ہے۔ مگر ریاض کی ذہنی تشکیل حیرت انگیز طور سے بالکل مختلف نہج پہ ہوئی اور 1967 میں رام موہن رائے سمعیری اسکول ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی وہ اشتراکیت کی طرف راغب ہو گئے۔ نومبر 1968 میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (بہار شاخ) کا ہفتہ وار رسالہ "مسائل" کے نام سے نکلا جس کی ادارت 1974 تک ریاض عظیم آبادی کے ذمے رہی۔ 1974 میں نہ صرف "مسائل" سے بلکہ پارٹی سے بھی الگ ہو گئے۔ اس دوران حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پٹنہ کالج پٹنہ سیٹی سے بی۔ اے آنرز (اردو) کا امتحان پاس کر کے پٹنہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے (اردو) کلاسز میں داخلہ لیا مگر امتحان نہیں دے سکے۔ البتہ اسی یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی جس کی بنیاد پر کچھ دنوں تک پریکٹس بھی کی۔ 1994 میں انھیں Times Fellowship ایوارڈ ملا جس کے تحت ایک پراجکٹ بہ عنوان "Impact of Urdu Journalism on Muslim Psyche" (بہ زبان ہندی) مکمل کیا۔ اس

سے قبل تین برسوں تک بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ اس کے علاوہ درجنوں سماجی وثقافتی تنظیموں کے عہدہ دار رہے جن میں انجمن ترقی اردو بہار، کشور دل اور آل انڈیا اردو رائٹرس ایڈ جرنلسٹ فورم کے نام اہم ہیں۔ فورم کے زیر اہتمام انھوں نے کئی تاریخ ساز ادبی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں وزیر اعظم ہند کے علاوہ مرکزی اور ریاستی وزراء اور ملک کے اہم ادیب وصحافی شریک ہوتے رہے۔ ان کانفرنسوں کے موقع پر سیکولرزم اور قومی یکجہتی کے لیے کام کرنے والے ادیبوں اور صحافیوں مثلاً خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ڈی۔ آر۔ گوئل اور عشرت علی صدیقی وغیرہ کو ایوارڈ بھی دیے گئے۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی اہلیہ سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ دوسری اہلیہ سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی (تا حال زیر تعلیم) ہے۔ زندگی کے ساٹھ سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ریاض عظیم آبادی فی الحال مذہب کی طرف رجوع ہو گئے ہیں مگر صحافت سے ان کا رشتہ برقرار ہے۔ ''بے باک قلم'' کے نام سے ان کے لکھے ہوئے کالم مقامی اخباروں کے علاوہ ملک کے تقریباً ایک درجن اخبارات میں برابر شائع ہوتے ہیں۔ صحافت میں ان کا نقطۂ نظر مثبت اور تعمیری رہا ہے اور وہ مخصوص مقاصد کے تحت مضامین لکھتے رہے ہیں۔ بحیثیت صحافی ان کی اہم خدمات درج ذیل ہیں:

1۔ 1947 تا 1968 - ہفتہ وار مسائل کی ادارت

2۔ 1947 تا 1977 - سیکولر ڈیموکریسی، دہلی کے نامہ نگار

3۔ 1977 تا 1986 - ہفتہ وار ''بلٹز'' بمبئی (اردو، ہندی اور انگریزی) کے بیورو چیف برائے بہار

4۔ 1986 تا 1990 - انڈین اکسپرس کے نمائندہ برائے بہار

5۔ 1990 تا 2000 - بیورو چیف ''ویک جاگرن'' برائے بہار

6۔ 2001 تا 2002 - روزنامہ آریہ درت (ہندی) اور انڈین نیشن (انگریزی) کے ایم۔ ڈی

7۔ 2007 تا حال - پندرہ روزہ سیکولر محاذ (پٹنہ) کے مدیر

8۔ ''بہار کے فرقہ وارانہ فسادات'' اور ''ریاض عظیم آبادی کے اداریے'' کے نام سے دو کتابیں زیر طبع

رحمان شاہی

سید ظل الرحمٰن (قلمی نام: رحمان شاہی) ابن سید فضل الرحمٰن تعلیمی سند کے مطابق 2 رفروری 1958 کو اپنے نانا جان حکیم محمد ذکریا کے گھر (بالکشن گنج گھیرا۔ پٹنہ) پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام ہاجرہ خاتون تھا۔ میٹرک کا امتحان اف۔ این۔ اس اکیڈمی سے پاس کیا۔ 1981 میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ کام کیا اور بہار راجیہ پل نرمان نگم لمیٹڈ پٹنہ میں سینیر اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ تا حال وہیں کام کر رہے ہیں۔ ان کے ماشاء اللہ چار بیٹے سرور علی، انور علی، عارف علی اور سیف علی ہیں جو مختلف اداروں میں زیر تعلیم ہیں۔

رحمان شاہی کی ادبی سرگرمیاں مختلف النوع رہی ہیں۔ 1970 کے آس پاس انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری شروع کی اور مقامی اخبارات و رسائل میں ان کے ایک دو افسانے چھپے۔ مگر ان کی ادبی شناخت کا آغاز اس وقت ہوا جب 1973 میں ان کی ایک کہانی ''گنہگار فرشتہ'' رسالہ ''زیور'' پٹنہ میں شائع ہوئی۔ اب تک انھوں نے اردو اور ہندی میں کم و بیش تین درجن افسانے لکھے ہیں جن میں سے اکثر ''زیور''، ''محاذ'' آہنگ، عصری ادب، ایوان اردو، روح ادب، سہیل، فکر و آگہی، شعر و حکمت، مژگاں، مباحثہ، پرواز ادب، زبان و ادب، انشاء، شگوفہ اور جیوتسنا (ہندی رسائل)

وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کی اہم کہانیاں راستے بند ہیں، لاوا، بسل، دھوپ کا سائبان، سلوگن ، بچے لوگ، سانپ کا پھن پکڑنے والے، مٹھی بھر آسمان، ''آگ'' اور ''جاڑے کی دھوپ'' ہیں۔

شاہی کی ادبی سرگرمیوں کا دوسرا رخ ان کی ڈرامہ نگاری سے عبارت ہے۔انھوں نے بہت سارے ریڈیائی اور یک بابی ڈرامے لکھے ہیں جو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے اردو اور ہندی پروگراموں کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔بعض ڈرامے بی۔بی۔سی لندن سے نشر ہوئے اور مختلف ادبی رسالوں میں بھی شائع کئے گئے۔ان کے مشہور ڈراموں میں کیکٹس کے پھول، سویرا، بیچ کی دیوار اور ''دچن'' وغیرہ خاصے مقبول ہوئے ہیں۔

شاہی ادبی صحافت سے بھی برابر وابستہ رہے ہیں۔1979 سے 1981 تک انھوں نے ایک خوبصورت ماہنامہ ''خمار'' نکالا۔ 1987 سے ادبی پندرہ روزہ ''نقاد'' کی اشاعت شروع کی۔جو غیر جانب دارانہ صحافت کا نمونہ تھا۔یہ وقفہ کے ساتھ اب بھی شائع ہو رہا ہے۔یہ دونوں ہی رسالے ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہیں اور اردو داں حلقے میں خاصے مقبول رہے ہیں۔

شاہی ابھی بے حد فعال ہیں۔ان کی افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری نئی جہتوں میں محوِ سفر ہے۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی ان کہانیوں اور ڈراموں کی اشاعت برابر ہو رہی ہے۔مختلف موضوعات پر مضمون لکھنے اور اہم ادبی شخصیتوں سے انٹرویو لینے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔رحمان شاہی کا افسانوی مجموعہ ''لاوا'' 2008 میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں سولہ افسانے ہیں۔اس کا پیش لفظ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ان کی درج ذیل تصنیفات کے زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے:

ایک اور دکھ (افسانوی مجموعہ)، کیکٹس کے پھول (ریڈیائی ڈرامے) چاند تاروں کا بن (ناول)، گفتگو (انٹرویوز)، منظر پس منظر (مضامین)

ڈاکٹر محمد منصور انصاری نے اپنی تصنیف ''بہار میں اردو ڈرامہ آزادی کے بعد'' میں لکھا ہے:

> ''رحمان شاہی تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔وہ ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے اور اظہار خیال کرتے ہیں۔وہ اپنی تخلیقات میں ادبیت اور سماجی احساس و شعور دونوں پر اصرار کرتے ہیں''

میں سمجھتا ہوں کہ رحمان شاہی جتنے اچھے کہانی کار ہیں اتنے ہی عمدہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ان کے افسانے اور ڈرامے ان سماجی ناہمواریوں کی پیش کش سے عبارت ہیں جو حساس دلوں کو احتجاج پر

آمادہ کرتی ہیں۔اس لیے ان کی کہانیوں میں خاص طور سے احتجاج کی ایک زیریں لہر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خود بھی لکھا ہے کہ وہ ایک پُر سکون اور آئیڈیل نظام حیات کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور مایوسی ان کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتی ہے۔ اردو تخلیقات کو ہندی میں متعارف کرانے کا جو کام شاہینے شروع کر رکھا ہے وہ بھی قابل ستائش ہے۔

ریحان غنی

سید ریحان غنی ابن سید شاہ نعمان غنی کا آبائی وطن دیورہ (ضلع گیا) ہے مگر ان کے دادا جو خانقاہ برہانیہ میں سجادہ نشیں تھے، دارالعلوم دیوبند سے حصول تعلیم کے بعد سجادگی ترک کر کے 1921 میں پھلواری شریف چلے آئے اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے قیام کے ابتدائی دنوں سے ہی وہاں ناظم مقرر ہو گئے۔ اس طرح پورا خاندان پٹنہ منتقل ہو گیا جہاں 2/مارچ 1952 کو ریحان غنی کی پیدائش ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم پھلواری شریف ہائی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بی۔ این۔ کالج پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور بالآخر پروفیسر ممتاز احمد، صدر شعبۂ اردو کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔ 'اردوئے معلی کی ادبی خدمات' کے موضوع پر تحریر کردہ یہ مقالہ محکمہ راج بھاشا حکومت بہار کے مالی تعاون سے اکتوبر 2007 میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''قوس قزح'' کے نام سے 1986 میں منظر عام پر آیا ہے۔

ریحان غنی بنیادی طور پر صحافی ہیں اور صحافت کا پیشہ انھیں وراثت میں ملا ہے۔ ان کے جد امجد مولانا سید شاہ عثمان غنی امارت شرعیہ بہار اڑیسہ کے ترجمان 'امارت' کے مدیر تھے۔ ان کی حق گوئی اور انگریزی حکومت کی مخالفت پر مبنی اداریوں کی اشاعت کے سبب اخبار پر مقدمہ چلا اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

پھر ایک ہزار روپے کی ضمانت بھی طلب کی گئی اور ضمانت ادا نہ کرنے کے سبب انگریزی سرکار نے اخبار بند کروادیا۔ ریحان کے والد بھی صحافت سے وابستہ رہے۔ ریحان نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1977 میں الحاج غلام سرور کے اخبار روزنامہ 'سنگم' سے کیا۔ اپریل 1981 سے روزنامہ 'قومی آواز' پٹنہ میں کام کرنے لگے۔ اسی زمانے میں محکمہ راج بھاشا نے بڑے پیمانے پر اردو ملازمین کی تقرری کی تو یہ بھی اپریل 1983 میں مترجم (ٹرانسلیٹر) کے عہدہ پر سہرسہ (بہار) میں ملازم ہوگئے۔ 1985 میں دوبارہ 'قومی آواز' پٹنہ میں واپس آگئے اور 1991 میں پٹنہ ایڈیشن کی اشاعت بند ہونے تک یہیں ملازمت کرتے رہے۔ اگست 1995 میں پٹنہ سے "انقلاب جدید" کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کے شعبہ ادارت میں شامل ہوگئے اور جون 1997 تک وہاں رہے۔ اس کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ 'افکار ملی' میں بہار کے نمائندے کی حیثیت سے مختلف سماجی و سیاسی موضوعات پر مضامین لکھتے رہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی کی ادارت میں 'سنگم' کی اشاعت نو ہوئی تو اس میں 'دوٹوک' کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کیا جو خاصا مقبول ہوا۔ کئی اور اخباروں اور رسالوں سے بھی وابستہ رہے۔ یہاں تک کہ مارچ 2004 میں روزنامہ 'پندار' پٹنہ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ جون 2007 سے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا نام شائع ہونا بند ہوگیا مگر اب تک اسی اخبار میں کام کر رہے ہیں۔

پرنٹ میڈیا کے ساتھ یہ الیکٹرونک میڈیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اپریل 1989 میں آکاشوانی پٹنہ سے اور پھر 1991 میں دوردرشن پٹنہ سے اردو خبریں شروع ہوئیں تو بالترتیب بحیثیت نیوز ریڈر اور عارضی ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ان کی تقرری ہوئی۔ اردو صحافت کی خدمات کے لیے ان 1996 میں 'انقلاب جدید' تو صلی ایوارڈ مل چکا ہے۔ 2008 تک انھیں راج بھاشا کرمچاری سنگھ، انجمن ترقی اردو بہار، ادارہ 'ہم نشیں' اور بہار اردو اکادمی کی جانب سے انعامات و اعزازات دیے گئے ہیں۔

ریحان غنی کی تحریریں بہ یک نظر ان کی صاف گوئی، بے باکی و بے خوفی اور جرأت گفتار کا احساس دلاتی ہیں۔ وہ زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے کی ایسی عادت میں مبتلا ہیں جس کے سبب انھیں اپنوں اور بیگانوں کی خفگی یکساں طور جھیلنی پڑتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ کسی ایک اخبار سے زیادہ دنوں تک وابستہ نہیں رہ پائے۔ مگر صحافت کی بنیادی اصولوں پہ قائم رہنے اور خود کو مصلحت پرستی سے الگ رکھنے کے سبب وہ صحافیوں کی برادری میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی بعض صحافی تحریریں یا مستقل کالم پڑھتے ہوئے ان کے اسلوب کی جارحیت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ مگر ان کے دردمند دل

کے خلوص پہ شک نہیں ہوتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے تحقیقی مقالے کا اسلوب ان کی صحافت کے اسلوب سے کافی مختلف ہے۔ 'اردوئے معلیٰ کی ادبی خدمات' کا یہ اقتباس خود ان کے لیے بھی مشعل راہ بن سکتا ہے:

> ''ایک اچھے اخبار نویس کی تحریر میں اعتدال اور توازن ہونا چاہئے۔ اس کا مشاہدہ مضبوط اور وسیع ہونا چاہیے۔ اس کے اندر ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے اور اس میں اعلیٰ علمی و ادبی صلاحیت ہونی چاہئے تا کہ وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح دوسروں کے احساسات و جذبات کو سمجھ سکے۔''

راشد احمد

راشد احمد ولد نسیم احمد محلہ گڑھ پر، بہار شریف (موجودہ ضلع نالندہ) تعلیمی سند کے اعتبار سے 5/جنوری 1964 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میٹرک اسکول بہار شریف سے حاصل کی اور 1979 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ نالندہ کالج، بہار شریف سے انٹر کرنے کے بعد پٹنہ آگئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز اور ایم اے (معاشیات) 1983 کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ہر نوجوان کی طرح سول سروسز کی طرف رجوع ہوئے۔ ابتدائی کامیابی بھی ملی مگر تحریری امتحان میں اچھا کرنے کے باوجود انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوئے تو دل برداشتہ ہوکر یہ راستہ چھوڑ دیا۔ ملک کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں افسروں کی بے بسی بھی نگاہ میں تھی اس لیے سرکاری نوکری سے یوں بھی گریزاں رہے اور بالآخر 1981 میں نیوز ایجنسی ''سماچار بھارتی'' میں پارٹ ٹائم کام کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد روزنامہ ''سنگم'' سے وابستہ ہوئے جہاں چار پانچ برسوں تک کام کیا۔ 1996 سے روزنامہ ''قومی تنظیم'' میں ملازم ہیں۔ اور بحیثیت صحافی، کالم نگار اور مقالہ نویس خاصے مقبول ہیں۔

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اپنے والدین اور اساتذہ سے گہری محبت اور عقیدت کے باوجود انھوں نے زندگی میں ایک آزادانہ راہ اختیار کی۔ وہ نہ تو والد کی طرح تجارت سے جڑے، نہ جماعت

اسلامی یا تبلیغی جماعت کے رکن بنے اور نہ درس و تدریس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ دنوں تک مختلف تعلیمی اداروں بشمول پٹنہ یونیورسٹی میں ماس کمیونی کیشن اور جرنلزم کے کلاسز ضرور لیے مگر بنیادی طور پر ایک صحافی رہے۔ دراصل اس میں ان کی افتادِ طبع کا خاصا دخل ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ہندوستان میں حالات بے حد برے ہونے کے باوجود سیکولر قدریں مضبوط ہیں اور ان کی جڑیں معاشرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ انھیں سٹانا محال ہے۔ اس سلسلے میں کئی ذاتی تجربے ان یادداشت کا حصہ ہیں جنھیں وہ اپنی تحریروں میں بیان کرتے رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان اور قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کے لیے کسی خاص جماعت یا طرزِ فکر سے وابستہ ہونا لازمی نہیں ہے۔ یہ کام کسی بھی سطح پر کیا جاسکتا ہے۔

راشد احمد کی صحافتی تحریروں اور خاص طور پر ان کے کالموں کا نمایاں وصف بے خوفی، بے باکی، راست گوئی اور جذبۂ اصلاح سے عبارت ہے۔ انھوں نے انسانی المیوں، سماجی سروکار کے مختلف پہلوؤں اور اقلیتوں کے مسئلوں پر بڑی تعداد میں مقالے لکھے ہیں جن کے کتابی شکل میں زیرِ طباعت ہونے کی اطلاع ہے۔ ان کے ایک کالم کا اقتباس نمونہ تحریر کے طور پر درج ذیل ہے جس میں نری جذباتیت نہیں ہے بلکہ ایک نوع کی ملی ہمدردی، شگفتگی اور آگہی کا ایسا آمیزہ ہے جس کی مثال موجودہ اردو صحافت میں کم نظر آتی ہے۔

> ''پہلے کم از کم مسجدوں میں ''محمود و ایاز'' بادشاہ اور غلام ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے لیکن اب تو مسجدوں میں بھی یہ نظر نہیں آتا، اب تو مسجد کی امامت اور مؤذن کے لیے ''ذات'' کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ امام بننے کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ پر پختہ ایمان شاید اب اتنا ضروری نہیں بچا جتنا ''ذات برادری اور مسلک'' پر ''پلتہ ایمان'' ضروری ہو گیا ہے۔ ہم تو وہ خودسر ہو گئے کہ وہ قرآن گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتے جس کی تفسیر کسی دوسرے مسلک والے نے لکھی ہو ہم اللہ کے اس فرمان کے لیے دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے اللہ کا فرمان اہم نہیں بچتا۔ مفسر سے نفرت زیادہ بڑی ہو جاتی ہے۔ ہم نماز قضا کر دینے اور چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس مسجد میں نہیں جاتے اس امام کے پیچھے نہیں کھڑے ہوتے جس کا تعلق دوسری ذات یا مسلک سے ہے حالانکہ وہ وہی آیتیں پڑھ رہا ہوتا ہے۔''

سید شاہد اقبال

سید شاہد اقبال ابن سید زین الحق رحمانی 17/اپریل 1957 کو قاضی محلہ آرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن مہدانواں (منیر شریف /ضلع پٹنہ) ہے۔ ابتدائی تعلیم مولانا سید شاہ نعمت امام قادری ندوی (پھلواری شریف) سے حاصل کی۔ مگدھ یونیورسٹی سے ایم-اے اردو (1981) ایم-اے فارسی (1982) بی- ایڈ (1985) اور پی-ایچ ڈی-اردو (1988) کرنے کے بعد فی الحال حکومت بہار کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کر رہے ہیں۔ اس سے قبل پروفیسر کلیم الدین احمد کی نگرانی میں مکمل ہونے والے اردو انگلش پروجکٹ' خدا بخش لائبریری پٹنہ، روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں مختصر مدت کے لیے کام کر چکے ہیں۔

سید شاہد اقبال نے 1987 کے آس پاس لکھنا شروع کیا ہے مگر اب تک ان کے کئی درجن تحقیقی وتنقیدی مضامین ہند و پاک کے اہم رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ''متاع حیات'' کتابچہ مرتبہ ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل کتاب منظر عام پر آئی ہیں۔

1. وفیات مشاہیر بہار (پیش لفظ پروفیسر مختار الدین احمد) 2000

2. تذکرۂ مہدانواں (پیش لفظ پروفیسر طلحہ رضوی برق) 2000

''وفیات مشاہیر بہار'' کی دوسری جلد زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے۔

دراصل سید شاہد اقبال کا بیشتر کام تاریخ نویسی اور اشاریہ سازی سے متعلق ہے۔ ویسے یہ کام بہت آسان لگتا ہے مگر ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے حقائق کو جمع کرنا اور ترتیب دینا' پھر ان کے بارے میں ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ کچھ لکھنا بے حد دشوار ہے۔ صرف ان کی پہلی کتاب 'وفیات مشاہیر بہار' کو ہی سامنے رکھئے تو ادبی تاریخ نویسی کے ساتھ ان کی پرخلوص وابستگی اور دوران تحریر پیش آنے والی دشواریوں کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے اپنے تعارف میں بہت برمحل اور بجا طور پر تذکرۂ ماہ و سال از مالک رام اور ''وفیات مشاہیر پاکستان'' یا خفتگان کراچی' از پروفیسر محمد اسلم کا حوالہ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید شاہد اقبال کے مطالعات ان کتابوں کے مقابلے میں کافی مختصر سہی مگر افادیت سے خالی نہیں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ مجھے توقع ہے کہ جو نیا راستہ سید شاہد اقبال نے اپنے لیے منتخب کیا ہے اس پر وہ آگے بڑھتے جائیں گے اور اس نوعیت کے دوسرے کاموں پر بھی توجہ دیں گے۔ غیر ادبی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے باوجود علم و ادب کے لیے اتنا وقت نکالنا اپنے آپ میں اہمیت کا حامل ہے۔

سلطان آزاد

محمد سلطان (قلمی نام سلطان آزاد) ابن محمد عثمان تعلیمی سند کے اعتبار سے 2 رجولائی 1958 کو پٹنہ سیٹی کے محلہ گلزار باغ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا حکیم شیخ محمد علی جان اپنے وقت کے اچھے طبیب بھی تھے اور ادب نواز بھی۔ ان کا تذکرہ اطبائے بہار جلد دوم از حکیم اسرار الحق میں موجود ہے۔ گھر میں کئی ادبی اور نیم ادبی رسالے پابندی سے آتے تھے اس لیے سلطان کو ابتدا سے ہی لکھنے پڑھنے کے لیے ایک سازگار ماحول رہا۔ اسکول کے اساتذہ، جن میں سرفہرست ناصر زیدی ہیں، کی سرپرستی نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی اور شبیر احمد کی حوصلہ افزائی نے افسانہ نگاری کی طرف توجہ دلائی۔ مختلف علمی و ادبی انجمنوں مثلاً بزم پرویز شاہدی، انجمن محمدیہ، انجمن فروغ اسلام وغیرہ سے وابستہ رہے اور ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں فیچر، ڈرامے، ریویو، تاثر، مقالات اور بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کی اشاعت ہوئی۔ مگر 1982 میں ''دبستان عظیم آباد'' کے نام سے ایک کتاب کی تصنیف نے ان کے ادبی مرتبے کو معیار اور وقار عطا کیا۔ اور ایسا محسوس ہوا جیسے سلطان آزاد کی شکل میں عظیم آباد کو اچھا محقق ملنے والا ہے۔ 1989 میں شائع شدہ ان کی ایک اور کتاب ''بہار میں اردو طنز و ظرافت'' نے اس احساس کو استحکام عطا کیا۔ مگر سلطان آزاد جلد ہی ادب کی دوسری جہتوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گرچہ اپنی تمام تر Limitations اور خامیوں کے باوجود

'دبستان عظیم آباد' آج بھی قابل قدر ہے۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ سلطان آزاد کی درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(1) شمع محفل (کلام مظہر عظیم آبادی) ترتیب وتدوین 1987، (2) تلاش وتجزیہ (تحقیق وتنقید) 2000، (3) سانچ کو آنچ نہیں (ادب اطفال۔ بچوں کی کہانیاں) 2001

سلطان آزاد کو بہار اردو اکادمی اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ، دہلی سے انعامات مل چکے ہیں۔ ان کی ادبی کاوشوں کا تذکرہ بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتدا تا حال از ڈاکٹر قیام نیر، بہار میں اردو ڈراما آزادی کے بعد از ڈاکٹر محمد منصور انصاری اردو ڈرامے میں بہار کا حصہ از ڈاکٹر محمد قاسم ''عظیم آباد اور اصناف ادب' از ڈاکٹر سید معزالدین اور ''اردو کی مزاحیہ صحافت' از فوزیہ حسن (پاکستان) میں موجود ہے مگر ادبی دنیا کو ابھی ان کے کسی نئے تحقیقی کام کا انتظار ہے۔

سید حسین احمد

سید شاہ حسین احمد ولد حکیم سید شاہ نسیم احمد کی پیدائش تعلیمی سند کے اعتبار سے 15 دسمبر 1957 کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کرنے کے بعد مروجہ دینی علوم مولانا کریم اور امیر طریقت سید شاہ عاشق حسین سجادہ نشیں خانقاہ دیوان شاہ ارزانی کی نگرانی میں حاصل کیے۔ 1974 میں پٹنہ مسلم ہائی اسکول سے میٹرک، 1976 میں اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی سے انٹر اور 1980 میں پٹنہ کالج سے بی۔اے اردو آنرز کے امتحانات پاس کیے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے 1982 میں ایم۔اے اردو اور ایل۔این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے 1986 میں پی ایچ۔ڈی کیا۔ کچھ برسوں تک آکاش وانی، پٹنہ اور خدا بخش لائبریری میں عارضی طور پر ملازمت کرتے رہے۔ نومبر 1996 میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کی سفارش پر مہارانجہ کالج آرہ میں اردو کے استاد ہوئے۔ کچھ دنوں ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ میں بحیثیت صدر شعبہ اردو و فارسی کام کرتے رہے اور فی الحال اسی شعبہ سے منسلک ہیں۔ اسی دوران 2001 میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔فارسی کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر حسین احمد بہار کے ایک معروف صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ممتاز عالم دین، شاعر اور ادیبوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان کے دادا سید شاہ ابراہیم حسین مجنی تخلص کرتے

تھے۔ عالم اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ حقیقت نماز، سیرت حسین اور ارشاد اعظم ان کی تصانیف ہیں۔ کلیات بھی موجود ہے۔ پردادا شاہ قاضی شرافت حسین کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ کئی برسوں تک گورکھپور، کلکتہ اور بہار کے متعدد اضلاع میں قضا کی خدمات انجام دیتے رہے اور آخر میں خانقاہ شاہ ارزانی کے قاضی القضاۃ رہے۔ ان کی تصانیف میں فتاوے کی کئی جلدوں کے علاوہ ''شجرہ ہائی سلاسل مختلفہ'' اور ''رسالہ وحدۃ الوجود'' کی خاصی اہمیت ہے۔ شاہ حسین احمد نے اپنے بزرگوں کی اس علمی و ادبی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ خانقاہ کے حوالے سے مختلف دینی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ وہ ادبی مضامین اور کتابوں کی اشاعت کی طرف بھی متوجہ رہے ہیں۔ ''اردو کی دو مثنویاں''، ''مطالعہ راسخ''، ''خدا بخش لائبریری کے اردو مخطوطات''، ''تصوف عہد بہ عہد'' اور ''حیات شیخ الاسلام'' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ درج ذیل تصنیفات کے زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے:

(الف) شاہ حامد: حیات اور کارنامے

(ب) سلام سندیلوی: حیات اور ادبی خدمات

(ج) فاعتبروا (تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

شاہ حسین احمد ہندوستان کے مختلف قومی سمیناروں میں شرکت کے علاوہ ادب اور تصوف کے موضوع پر لکچر دینے کے لیے ایران، افغانستان اور ازبکستان کا بھی سفر کر چکے ہیں۔ آکاش وانی پٹنہ اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے ان کے مقالات، فیچرز اور ڈرامے نشر ہوتے رہے ہیں۔ ان کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جو نہایت تندہی مگر خاموشی کے ساتھ علمی و ادبی موضوعات پہ کام کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اپنے لیے چند اہم موضوعات کا انتخاب کر لیں اور زبان و بیان کی سطح پر شفاف بیانیہ سے کام لے سکیں تو نئے ادبی منظرنامے میں بہ آسانی اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ انھیں وقتی سرگرمیوں سے دور رہ کر دیرپا نوعیت کے تحقیقی کام کرنے چاہئیں تاکہ ان کے ادبی وزن، وقار میں بھی اضافہ ہو اور اردو کو ایک اچھا محقق مل سکے۔

شین مظفر پوری

محمد ولی الرحمٰن شیدا ولد حافظ محمد عین الحق 15 رجولائی 1920 کو باتھ اصلی (موجودہ ضلع سیتا مڑھی، پہلے ضلع مظفر پور) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کلکتہ کی ایک مسجد میں امام تھے اور وہ بیٹے کی پیدائش کے بعد صرف ایک ہی سال زندہ رہے۔اس لیے ابتدائی تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت بڑی پھوپھی کی نگرانی میں ہوتی رہی۔ کچھ دنوں گھر پہ ایک پرائیوٹ استاد سے انگریزی اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد 1931 میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا مگر مختلف اسباب کی بنا پر میٹرک کا امتحان نہ دے سکے۔بعد میں 1937 میں عبداللہ سہروردی میموریل ایچ-ای-اسکول سے یہ امتحان پاس کیا اور معاشی تنگی کی وجہ سے آگے کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر اخبارات کی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔1940 میں ان کی پہلی شادی بی بی زیب النساسے ہوئی جن کا 1957 میں انتقال ہو گیا۔ڈاکٹر حسن رضا کی تصنیف" شین مظفر پوری :شخصیت اور فن" (2002) میں اکثر سوانحی حالات کی تفصیل موجود ہے۔شین مظفر پوری کی ادبی زندگی کا آغاز 1937 کے آس پاس ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے کا فی دنیا دیکھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا، پاکستان بھی گئے۔اخبارات و رسائل کے علاوہ فلموں اور ریڈیو میں بھی طبع آزمائی کی مگر 1960 کے آس پاس واپس بہار آئے اور پٹنہ کے ہو کر رہ گئے۔

یہاں انھیں بہت زیادہ معاشی خوش حالی تو نہ ملی مگر آسودہ حالی ضرور میسر آئی۔ مختلف اخبارات میں کام کرتے ہوئے بالآخر بہار اردو اکادمی کے رسالہ ''زبان وادب'' کے مدیر ہوئے اور تا عمر پٹنہ ہی ان کی کار یہ بھومی رہی جہاں انھوں نے جنم بھومی سے زیادہ دن بسر کیے۔ 'زبان وادب' سے علیحدگی کے بعد بھی وہ مختلف اداروں سے جڑے رہے گرچہ صحت برابر گرتی رہی اور بالآخر 14 راگست 1996 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اپنے آبائی قبرستان باتھ اصلی (سیتامڑھی) میں مدفون ہوئے۔

غور کیا جائے تو شین مظفر پوری صحیح معنوں میں قلم کے مزدور تھے جن کی ذاتی زندگی کی محرومیاں کسی نہ کسی طور پر ان کی تحریروں کو متاثر کرتی رہیں۔ ابتدا میں انھوں نے تلاشِ معاش میں جس قدر جادہ پیمائی کی اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ فوری طور پر پیسے حاصل کرنے کے لیے غیر معیاری اور سطحی مذاق کی حامل کہانیاں لکھتے رہے۔ ''شمع'' ''بیسویں صدی'' یا اس طرح کے مقبول عام رسائل و اخبارات میں جو تحریریں شائع ہوئیں ان کا مزاج عوامی معیار یا ڈیمانڈ کے مطابق تھا۔ گرچہ فنی اعتبار سے یہ تحریریں بھی خام نہیں ہیں لیکن اس نقش اول کے سبب اکثر نقادان کے افسانوں اور ناولوں پر تبصرہ کرنے سے گریزاں رہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے پہلی بار ان کے افسانوں میں ماجرا سازی کے حسن اور کہانی پن کی دلکشی کی طرف توجہ دلائی۔ پھر بعض اور نقاد بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تفہیم نو کا مرحلہ شروع ہوا۔ انھیں راشٹر بھاشا پریشد اور مختلف اردو اکادمیوں سے انعامات واعزازات ملے اور ان کی وفات کے بعد ''زبان وادب'' پٹنہ میں ان سے متعلق ایک گوشہ شائع ہوا۔ پھر 11/12/ نومبر 2009 کو شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی میں ان پر ایک سمینار ہوا جس کی روداد ''جریدہ'' 2011 میں شائع ہوئی۔ میں نے بہار راجیہ ابھی لیکھا گار سے شائع شدہ کتاب ''اردو ساہتیہ کے وکاس میں بہاری دیھوتیوں کا یوگ دان'' میں ان پر ایک طویل مضمون شائع کیا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تفہیم کا حق اب تک ادا نہیں ہو سکا ہے چونکہ فکشن رائٹر کی حیثیت سے ان کے ادبی مقام کے تعین میں وہ ابتدائی تحریریں سدِ راہ بن گئی ہیں جو محض حصول زر کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ورنہ ان کا اصل مزاج ایک شدید قسم کے احتجاج اور فنی شائستگی دونوں سے عبارت ہے جو بعد کے بعض افسانوں میں نمایاں ہے۔

شین مظفر پوری کی ادبی شخصیت کا ایک اور پہلو صحافت سے تا عمر وابستگی ہے۔ لاہور، کراچی، دہلی، کلکتہ، اور پٹنہ وغیرہ کے مختلف رسائل واخبارات میں وہ خود اپنے نام سے اور فرضی ناموں سے بھی مضامین لکھتے رہے ہیں جن کی تلاش اور تعیین قدر فی الحال زیادہ مشکل نہیں۔ ان کے افسانوں کے ایک انتخاب کی بھی ضرورت ہے مگر یہ سارے کام کون کرے؟

شین مظفر پوری کی تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ آوارہ گرد کے خطوط (افسانے) مطبوعہ 1946 اس کا دوسرا ایڈیشن 'بند کمرہ' کے نام سے منظر عام پر آیا۔
2۔ فرحت (ناولٹ) مطبوعہ 1949
3۔ دکھتی رگیں (افسانے) مطبوعہ 1949
4۔ کڑوے گھونٹ (افسانے) مطبوعہ 1949
5۔ ہزار راتیں (ناول) 1955
6۔ چاند کا داغ (ناول) مطبوعہ 1956
7۔ لڑکی جوان ہوگئی (افسانے) مطبوعہ 1956
8۔ تین لڑکیاں ایک کہانی (ناول) مطبوعہ 1959
9۔ کھوٹا سکہ (ناول) مطبوعہ 1961
10۔ دوسری بدنامی (افسانے) 1965
11۔ حلالہ (افسانے) مطبوعہ 1976
12۔ آدھی مسکراہٹ (طنز و مزاح) مطبوعہ 1980
13۔ خون کی مہندی (ڈرامے) 1984
14۔ طلاق' طلاق طلاق (افسانے) 1987
15۔ قانون کی بستی (افسانے) 1989
16۔ نئی الف لیلیٰ مطبوعہ 1991
17۔ رقص بسمل (یادداشت) نومبر 1993

شبیر احمد

شبیر احمد ولد عبدالودود اپنی نانیہال اسلام پور بڑی لہریاسرائے (دربھنگہ) میں تعلیمی سند کے اعتبار سے 16/جولائی 1942 کو پیدا ہوئے۔ ''ہو بہو'' میں تاریخ پیدائش 30/مارچ 1938 لکھی گئی ہے جو غالباً اصل تاریخ ہے۔ایم- اے (اردو) تک تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد پٹنہ کے ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ملازمت کے دوران ہی ''سہیل عظیم آبادی'' سے متعلق تحقیقی مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی پروفیسر لطف الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کر کے بھاگلپور یونیورسٹی سے سند حاصل کی۔ 3/جون 2005 (افتخار عظیم چاند کے مطابق ۷/جون) کو پٹنہ میں انتقال ہوا اور شاہ گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔

بقول سلطان آزاد شبیر احمد کی ادبی زبان کا آغاز 1957 میں نثر نگاری سے ہوا۔انھوں نے افسانے، مضامین اور تبصرے لکھے جو سیپ (کراچی) آہنگ (گیا) اور بیسویں صدی (دہلی) وغیرہ میں شائع ہوئے یا ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔ان کی وفات کے چند مہینوں بعد افتخار عظیم چاند (جو ان دنوں انجمن ترقی اردو کے آفس سکریٹری تھے) کا ایک اچھا مضمون ''ہم تمھیں بھلا نہ پائیں گے'' روزنامہ ''پندار'' پٹنہ (5/اگست 2006) میں شائع ہوا تھا جس میں موصوف کی حیات اور شخصیت کے

ساتھ ساتھ سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے۔

اردو زبان وادب سے شبیر احمد کی وابستگی کے تین نمایاں پہلو رہے ہیں۔ اول تو یہ کہ وہ ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری رہے اور پروفیسر عبدالمغنی کی رہنمائی میں اردو تحریک کو آگے بڑھانے، بہار میں اردو کو سرکاری زبان بنوانے اور اس پر عمل درآمد کے مرحلوں میں فعّال رہے۔ دوسرے یہ کہ ابتدا میں روزنامہ ''صدائے عام'' اور اس کے بعد کئی اور اخبارات ورسائل کے ذریعہ اردو صحافت سے جڑے رہے۔ سوم یہ کہ انھوں نے بہت خوب صورت افسانے لکھے جو رسالوں میں بھی شائع ہوئے اور مجموعے کی شکل میں بھی۔

شبیر احمد کے افسانوں میں عام طور سے عہد حاضر کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے وہ مناظر نمایاں ہوتے ہیں جن کا براہ راست تعلق موقع پرستی یا مصلحت پسندی سے ہے اور جنھوں نے اس کی دل پسند سادہ اور معصوم طرز زندگی چھین لی ہے۔ ویسے انھوں نے متوسط طبقوں کے سوز وساز و درد و داغ و آرزو کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ ان کی بہت ساری تخلیقات جو رسائل و اخبارات میں بکھری ہوئی ہیں، اب شاید ہی کتابی شکل میں منظر عام پر آسکیں۔ بہر حال اب تک ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

1۔ اعتراف (افسانوں کا مجموعہ) جولائی 1976

2۔ ہو بہو (افسانوں کا مجموعہ) ستمبر 1986

3۔ سہیل عظیم آبادی کی ادبی تہذیب۔ (پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ) 1990۔

شموئل احمد

شموئل احمد خاں ولد جمیل احمد خاں تعلیمی سند کے لحاظ سے 8/ اکتوبر 1945 کو بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے تاریخ پیدائش 4/مئی 1950 لکھی ہے جو مختلف شہادتوں کی بنیاد پر غلط ہے۔ چونکہ ان کے والد مجسٹریٹ تھے اور ان کا برابر تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس لیے شموئل احمد کی تعلیم کئی جگہوں پر ہوئی۔ یہاں تک کہ رانچی یونیورسٹی سے 1968 میں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا اور حکومت بہار کی ملازمت میں آگئے۔ ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف علمی و ادبی و سماجی وفلاحی کاموں میں مصروف ہیں۔

شموئل احمد پٹنہ کے ادبی حلقوں میں ابتدا سے ہی انفرادی حیثیت کے حامل رہے۔ ان کی پہلی کہانی ''چاند کا داغ'' ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ میں 1963 میں شائع ہوئی جب وہ طالب علم تھے مگر اسی زمانے سے وہ ناقدوں کی نگاہ میں آگئے۔ پھر ان کا ایک افسانہ ''بگولے'' ماہنامہ 'تحریک' دہلی میں چھپا اور وہ جنسی موضوعات ومحرکات پر کہانی لکھنے والوں کی صف میں شمار کیے جانے لگے۔ بعد کے دنوں میں انھوں نے گہرے انسانی رشتوں اور سماجی رویوں پر مبنی بہت معنی خیز کہانیاں لکھیں اور اس نکتے پر زور دیا کہ انسانی جبلت بہرحال اپنا کام کرتی رہتی ہے اور انفرادی یا اجتماعی رویوں پر اس کے اثرات

عام طور پر مرتب ہوتے ہیں۔غور کیجئے تو اپنے افسانوں میں وہ کچھ خاص موضوعات کو ترجیح ضرور دیتے ہیں مگر ان کے مشاہدات و تجربات کی دنیا وسیع ہے اور اسی اعتبار سے ان کے یہاں کافی Diversions یا انحراف کی مثالیں ملتی ہیں۔اس لیے ایک طرف وہ ''بگولے'' ''برف میں آگ'' اور ''سنگھاردان'' جیسے افسانے لکھ کر نفسیاتی پہلوؤں سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے ہیں تو دوسری طرف فسادات اور تشدد سے متعلق افسانے لکھتے ہیں سیاست اور بیوروکریسی کے ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ''مہاماری'' پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ان کا اپنا بیان ہے کہ وہ کبھی بھی سوچ کر افسانہ نہیں لکھتے بلکہ جیسا کہانی کا مطالبہ ہوتا ہے اس کے اعتبار سے واقعات ابھرتے جاتے ہیں۔علم نجوم سے متعلق مباحث یا مختلف راشیوں کے اثرات کی پیشکش میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور جنسی عوامل کے بیان میں بھی۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے جس میں مختلف ناقدین اپنے اپنے طور پر حصہ لیتے رہے ہیں۔ میں ان کی ایک نئی کہانی ''عنکبوت'' کے حوالے سے اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ روایتی صورت حال کی پیش کش تک محدود نہیں ہیں بلکہ بدلتے ہوئے سماجی حالات میں روایتیں جس طرح اپنا رنگ بدل رہی ہیں اس کی آئینہ داری پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔انٹرنیٹ، چیٹنگ اور فیس بک کے اس عہد میں انسانی رشتے خصوصاً میاں بیوی کے رشتے کیا صورت اختیار کر رہے ہیں اس کا ایک چونکا دینے والا بیان اس افسانے میں موجود ہے۔شاید یہ آنے والے دور کی دھندلی سی نہیں، بہت واضح تصویر ہے۔ان کے اسلوب سے متعلق وہاب اشرفی نے درست لکھا ہے کہ ان کے یہاں زبان میں رخنہ نہیں، جملے پر پیچ نہیں اور اسلوب کو ہموار رکھنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ کوئی استعاراتی نظام قائم نہیں کرتے، نہ ہی علاقائی انداز کو ابہام کی صورت میں پیش کر کے پیچیدہ بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے افسانوں اور ناولوں کی مقبولیت اور دلکشی کا ایک بڑا سبب ان کا رواں اور کھلا ہوا اسلوب ہے جو زبان و بیان پر ان کی قدرت کا ثبوت ہے۔

اب تک شموئل احمد کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

بگولے (افسانوی مجموعہ) سنگھاردان (افسانوی مجموعہ) 1991

القمبوس کی گردن (افسانوی مجموعہ) 1998، عنکبوت (افسانوی مجموعہ) 2010

ندی (ناولٹ) 1999، مہاماری (ناول) 2005

ان کے ناولٹ ''ندی'' کا انگریزی میں ترجمہ جرمن اکادمی نے شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ Stories from the third world کے تحت ''سنگھاردان'' کی منتخب کہانیاں انگریزی میں

The dressing table کے نام سے شائع ہونے کی اطلاع ہے۔ سنگھار دان اور مزید دس کہانیوں کے ہندی میں ''مرگ ترشنا'' کے نام سے چھپنے کی بھی خبر ہے۔ ان کی چند کہانیوں پر ٹیلی فلم بھی زیر تکمیل ہیں۔

حال ہی میں انھیں اردو زبان وادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں مجلس فروغ ادب' دوحہ' (قطر) کا باوقار ایوارڈ برائے 2012 بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کے بعض اچھے تنقیدی مضامین بھی معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

شمیم فاروقی

سید محمد شمیم احمد (ولد سید قسیم الدین احمد و بی بی سیدہ قیومن) کی پیدائش صوفیوں کی بستی بیتھو شریف (گیا) میں تعلیمی سند کے اعتبار سے 25 دسمبر 1943 کو ہوئی۔ سلسلہ نسب حضرت سید سلطان جہانگیر اشرف سمنانی سے ملتا ہے۔ بچپن کے چند سال ڈاکٹر سید عبد الستار کی سرپرستی میں سندر گڑھ اڑیسہ میں گزرے۔ والد کا کم سنی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس لیے ان کی والدہ کا عقد ثانی سید محمد فاروق سے ہوا جن کی پہلی بیوی وفات پا چکی تھیں۔ اس کے بعد شمیم گملا (رانچی کے قریب ایک جگہ) آگئے اور یہیں سے 1959 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گھر کے حالات بہت سازگار نہیں تھے۔ انھیں ابتدا میں سوتیلے باپ یعنی فاروق صاحب کی نفرت بھی جھیلنی پڑی مگر رفتہ رفتہ ان کا رویہ نارمل ہوتا گیا اور انھوں نے شمیم کو آگے تعلیم جاری رکھنے میں معاونت بھی کی مگر وہ گھر کے ماحول سے نالاں ہوکر بمبئی چلے گئے جہاں کئی برس مقیم رہے اور اہم فلمی شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ 1965 میں واپس گملا آئے جہاں سلطانہ خاتون (فاروق صاحب کی پہلی اہلیہ کی صاحبزادی) سے شادی ہوگئی۔ رانچی یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ مختلف سرکاری اور نجی اداروں میں ملازمت کرنے کے بعد بالآخر آل انڈیا ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہوگئے۔ پھر پروگرام ایکزی کیٹو کی

ملازمت ملی۔ مئی 1975 سے پٹنہ میں تبادلہ ہوگیا۔ درمیان میں کئی دوسری جگہوں پر پوسٹنگ ہوئی مگر 31 دسمبر 2003 کو یہیں سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریٹائر ہوگئے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد بہت دنوں بعد از راہ ہمدردی کرن نام کی ایک خاتون سے دوسری شادی کرلی جنھوں نے قبول اسلام کرلیا تھا۔ شمیم فاروقی کی حیات اور شاعری سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ شمع حسن نے پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کی نگرانی میں جمع کیا ہے جس میں ان تمام امور کی تفصیل درج ہے۔

شمیم فاروقی نے 1960 کے آس پاس شاعری کا آغاز کیا اور بمبئی کے قیام کے دوران دوستوں کے مشورے کے مطابق شفا گوالیاروی سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر آزادانہ فکر سخن کرنے لگے۔ شمیم فاروقی کا مجموعہ کلام ''ذائقہ میرے لہو کا'' 1987 میں منظر عام پر آچکا ہے اور بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔ انھوں نے ادب کی اہم شخصیتوں مثلاً معین حسن جذبی شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ پر مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کے احساس کی تازگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''کاسہ'' کے زیر اشاعت ہونے کی اطلاع ہے۔

میرا خیال ہے کہ شمیم فاروقی جہاں بینی سے زیادہ خود بینی میں مصروف رہے ہیں۔ خود اپنی ذات کے اسرار اور پیچ وخم انھیں سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ اگر ان کی زندگی کے حالات سامنے رہیں تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ انھوں نے بڑی خاموشی سے قطرہ قطرہ زندگی کا زہر پیا ہے اور اس پورے عمل کو اپنی شاعری کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے ان کے والد شاعر رہے ہوں (جیسا کہ ان کی والدہ کا بیان نقل ہوتا رہا ہے) مگر اس سے شمیم فاروقی کی اپنی انفرادیت کہیں متاثر نہیں ہوئی۔ البتہ ایک عجیب وغریب حزنیہ کیفیت اور قلندرانہ بے نیازی کا ان کے کلام میں جگہ پانا فطری عمل کہا جاسکتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ہم نے خوشی سے پیار کا ہر زہر پی لیا
ہم دوستی کے نام پہ ہر بات سہہ گئے

چلو وہ شخص اگر خوش نہیں خفا تو ہے
بچے نباہ یہ تھوڑا سا فاصلہ تو ہے

ان کی ستم شناس اداؤں کے باوجود
اک عمر کاٹ دی ہے انھیں دوستوں کے ساتھ

مدت ہوئی سنا تھا کوئی شہر جل گیا
ہم اس کے بعد دوستو پھر گھر کہاں گئے

خامشی سے ڈوبنے والے ہمیں کیا دے گئے
ایک انجانے سفر کی کچھ نشانی کشتیاں

آج بھی اشکوں کے اس گہرے سمندر میں شمیم
تیرتی پھرتی ہیں یادوں کی پرانی کشتیاں

شان الرحمٰن

شان الرحمٰن ابن سید مجیب الرحمٰن (سہیل عظیم آبادی) کی تاریخ پیدائش 11 ردسمبر 1948 ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پہ حاصل کی۔ رام موہن رائے سمینری اسکول سے 1965 میں میٹرک پاس کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے- (سماجیات) کا امتحان پاس کرنے کے بعد صحافت کی راہ اختیار کرنی چاہی مگر والد محترم کی ہدایت کے مطابق آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں آگئے اور وہیں سے پروگرام ایکزی کیٹو' آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ خود شادی نہیں کی مگر بڑے بھائی لطیف الرحمٰن کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت میں ہمہ وقت دل چسپی لیتے رہے۔ ویسے بھی مزاجاً وہ بے حد سادہ دل بے باک، اور دردمند انسان ہیں۔ اور وسیع سماجی تعلقات پر یقین رکھتے ہیں۔ جس کے سبب بعض لوگوں نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

شان کی ادبی زندگی کا آغاز 1970 کے آس پاس ہوا۔ انھوں نے کچھ مضامین بھی لکھے مگر بہت جلد صرف شاعری کے ساتھ وابستہ رہ گئے۔ انھوں نے باضابطہ طور پہ شاید کسی سے اصلاح نہیں لی مگر علامہ جمیل مظہری کو اپنا استاد معنوی مانتے ہیں۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''کیف عظیم آبادی ایوارڈ'' مل چکا ہے۔ فی الحال کئی برسوں سے علیل ہیں اور محلہ نوگھردا، سلطان

گنج، پٹنہ میں مقیم ہیں۔ ایک شعری مجموعہ زیر ترتیب ہونے کی اطلاع ہے۔

شان کی غزلوں میں ایک خاص تیور کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس تیور میں ایک طرف تو تصوف کے بعض بنیادی اجزا مثلاً قناعت، بے نیازی اور خود آگہی کی آمیزش ہے اور دوسری طرف ایک بہتر مستقبل کی امید بھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔

گلوں سے بیر ہے کانٹوں سے آشنائی ہے — یہ کیسا شہر ہے کیسی یہاں خدائی ہے
ہم اپنے عہدِ رفاقت کو کیا کریں مولا — جہاں بھی جائیں وہاں موسم جدائی ہے
ہمارے پیٹ کے پتھر پہ طنز مت کرنا — ہمارے گھر میں پیمبر کی رسم آئی ہے

نہ تھک کے بیٹھ کہ تیری اڑان باقی ہے — زمین ختم ہوئی آسمان باقی ہے

اس نے آنکھیں موند لیں اب کوئی رت آیا کرے — یہ جہاں اپنے کئے پر لاکھ پچھتایا کرے
زندگانی اور مجھ میں روز اک تکرار ہے — میں اسے سمجھاؤں اور یہ مجھ کو سمجھایا کرے
گر یہ پاگل پن نہیں اس کا تو آخر کیا کہیں — روز لے کر آئینہ اندھوں کو دکھلایا کرے

شوکت حیات

سید شوکت حیات ولد سید محفوظ الحق یکم دسمبر 1950 کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ یہ درست ہے کہ شوکت حیات کے پردادا گیلانی سے کاشی چک آ گئے تھے جہاں ان کی زمیں داری تھی مگر ایک ادبی مورخ کا یہ بیان غلط ہے کہ وہ کاشی چک ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم رام موہن رائے سمینری (پٹنہ) میں ہوئی جہاں سے 1966 میں انھوں نے میٹرک پاس کیا اور سائنس کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔آئی۔ایس۔سی۔کرنے کے بعد کچھ دنوں تک پٹنہ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کی مگر نکسلی تحریک سے وابستگی کے سبب تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔کچھ دنوں کے بعد انھوں نے بی۔ایس۔سی اور ایم۔اے اردو (گولڈ میڈلسٹ) کے امتحانات پاس کیے اور یو جی سی نیٹ کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔مگر اسی دوران اسٹیٹ کوآپریٹو مارکٹنگ یونین (پٹنہ) میں ملازمت مل گئی اور تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ مارچ 1985 میں ارشاد پروین سے شادی ہوگئی جس سے ایک بیٹا (اتم حیات عرف نہال) اور ایک بیٹی (انا حیات عرف نشا) ہے۔بسکومان کی مالی بدحالی کے سبب وہ وقت سے پہلے ہی ملازمت سے علیحدہ ہوکر گزشتہ بیس پچیس برسوں سے ہمہ وقتی طور پر علم وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

شوکت حیات نے مضامین بھی لکھے ہیں مگر وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ان کی پہلی کہانی

''بکسوں سے دبا آدمی'' رسالہ کتاب' لکھنؤ سے 1970 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کا ایک افسانہ ''بانگ'' بہت مشہور ہوا۔ غالباً اسی نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوا تھا مگر اب اسکا سراغ نہیں ملتا۔ ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' 2010 میں منظر عام پر آیا ہے۔ دو افسانوی مجموعوں ''پھسنڈا'' اور ''رانی باغ'' کے زیر اشاعت ہونے کی اطلاع ہے۔ ''1970 کے بعد اردو افسانہ'' کے موضوع پر تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی زیر طبع ہے۔ انھیں گنبد کے کبوتر، کے لیے قومی کتھا ایوارڈ 1996 مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہار اردو اکادمی سے کئی بار انعامات واعزازات حاصل ہوئے ہیں۔ 1970 کے بعد شائع ہونے والی اردو افسانے کی تقریباً ہر انتھولوجی میں ان کا کوئی نہ کوئی افسانہ شریک رہا ہے۔ اور وہ قومی سطح پر رسالوں اور سمیناروں میں بے حد فعال رہے ہیں۔

افسانہ نگاری کے حوالے سے شوکت حیات خود کو ترقی پسند اور جدیدیت سے الگ ایک نئی تھیوری 'انامیت' کا بنیاد گزار مانتے ہیں اور افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل کو اس ادبی تصور سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریے کی تشریح میں انھوں نے خاصا وقت صرف کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری سے متعلق ہندو پاک کے اہم ترین مشاہیر اردو کے تاثرات ان کے افسانوی ''گنبد کے کبوتر'' میں موجود ہیں۔ ان امور کی تکرار کئے بغیر میں یہاں وارث علوی کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے ان کے اسلوب کے امتیازات واضح ہو جاتے ہیں:

> ''شوکت حیات کو زبان اور بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ ان کے معمولی افسانوں میں بھی یہ حسن برقرار رہتا ہے ان کی نثر بڑی ہموار ہے۔ ایک کے بعد دوسرا جملہ سمندر کی لہروں کے مانند سبک ساری سے آتا ہے.....ان کے یہاں پیچیدگی ہے لیکن الجھاؤ نہیں، اشارے کنائے اور ابہام ہے جو اہمال سے بارہ پتھر دور رہتا ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر کی ایک ایسی صورت شوکت حیات کے بیشتر افسانوں میں موجود رہی ہے جو احتجاج کی عمومی صورتوں سے الگ ہے۔ شاید اپنے اسی امتیاز کا عرفان حاصل کر کے وہ خود کو ایک نئے ادبی نظریے اور اس کی علمی صورت کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔

شمیم قاسمی

شمیم الدین احمد علی (قلمی نام: شمیم قاسمی) ولد نصیر الدین علی، تعلیمی سند کے مطابق یکم جنوری 1954 کو تاریخی شہر سہسرام (موجودہ ضلع روہتاس) میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق سہارنپور (اتر پردیش) کے ایک قصبہ چانسٹھ سے تھا جہاں وہ عہد فرخ سیر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ سید محمد علی خان (داروغہ) کی شادی قدیم ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک معزز پٹھان گھرانے میں بی بی کاسو سے ہوئی تھی جن کا خاندانی شجرہ سہسرام کے پہلے دیوان شاعر راحت سہسرامی سے ملتا ہے (بحوالہ تاریخ سہسرام: وزیر علی خاں مصلح سہسرامی)۔ شمیم قاسمی کے خانوادے کو سہسرام میں بی بی کاسو کے گھرانے کی نسبت سے ہی خاندانی تشخص حاصل ہوا۔ ان کے دادا عبدالعزیز علی کو خان بہادر کا خطاب ملنے سے اس خاندان کی شناخت کو مزید استحکام ملا۔

شمیم قاسمی کے بزرگوں کا شعر و ادب کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا مگر گھر کا ماحول نیم مذہبی اور نیم ادبی ضرور تھا۔ اردو کے کچھ رسائل و جرائد آتے تھے اور نسیم حجازی۔ صادق سردھنوی، یا ابن صفی کے ناول بھی پڑھے جاتے تھے۔ گھر سے باہر کا ماحول نسبتاً زیادہ ادبی تھا اور شعر و سخن کی طرحی و غیر طرحی محفلیں پابندی سے منعقد ہوتی تھیں جن میں رفتہ رفتہ شمیم قاسمی نے بھی شرکت کرنی

شروع کر دی اور 1970 میں میٹرک کا امتحان دینے کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے میدان میں بھی قسمت آزمائی کرنے لگے۔ یہی ان کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ بعد میں ان کے ادبی ذوق کو سہسرام کے مشہور شاعر سید احمد علی سیف اور ان کے بڑے بھائی علامہ کیف سہسرامی کی رہنمائی نے جلا بخشی اور رفتہ رفتہ وہ نہ صرف مشاعروں میں شریک ہوئے بلکہ رسالوں میں شائع بھی ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بقول پروفیسر طلحہ رضوی برق ''ہر چند پیشہ آبا سپہ گری تھا مگر شمیم کے ہاتھ میں سیف نوک قلم بن کر رقص کناں ہے۔'' بہر حال شمیم بی۔ اے کرنے کے بعد بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل میں ملازم ہو کر پٹنہ آ گئے اور گذشتہ 53 / برسوں سے پٹنہ ہی ان کا وطن ثانی بن چکا ہے۔ اس دوران انھوں نے ایم۔ اے (اردو) کا امتحان پاس کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ان کا مقالہ زیر تکمیل ہے۔ پٹنہ کی علمی و ادبی فضا میں انھوں نے گذشتہ پچیس برسوں کے دوران اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کی ہے۔ شعر و ادب کی آب یاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل (محکمہ تعلیم) کے اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے تعلیمی سطح پر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے سنجیدہ اور ثمر آور کوششیں کی ہیں۔

دراصل شمیم قاسمی کی ادبی شخصیت کو کسی ایک خانے میں رکھنا مشکل ہے۔ بنیادی طور پر انھیں شاعر کہنا ہی درست محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ اب تک ان کے تین شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جن میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ مگر تقریباً پندرہ برس پہلے ان کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ جس میں عصری رجحانات و میلانات کی فنکاری کی پیش کش نے فکشن کے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ گاہے گاہے وہ بعض اہم ادبی شخصیات و مسائل سے متعلق مضامین یا تبصرے بھی لکھتے رہے ہیں جن میں ان کا تیکھا مگر تخلیقی اسلوب دلکشی کا سبب بنتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے انھیں ایسا شاعر قرار دیا ہے جس کے یہاں ایک طرف تو جدیدیت کی فکر نمایاں ہے اور دوسری طرف مابعد جدیدیت کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے کا رجحان بھی ہے۔ بقول حقانی القاسمی ''انھوں نے شعری فرہنگ کی تشکیل جدید کی ہے''، لسانی اور فکری شکست و ریخت سے گذرنے کا یہ عمل اور جذبہ ہی انھیں منفرد بناتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غیر ادبی مشغولیات کے مصروف ترین اوقات میں سے شاعری کے لیے وقت نکالنا اپنے آپ میں ادب سے مخلص اور غیر مشروط وابستگی کا ثبوت ہے جو اس عہد میں بڑی بات ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ شمیم قاسمی شعوری طور پر اپنی فکر اور ڈکشن کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کرتے ہیں اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ان کی تصنیفات درج ذیل ہیں:

گمشدہ موسم۔(شعری مجموعہ) 1984،آتش نشاں (شعری مجموعہ) 1993، پانچ سلاخوں والا کمرہ (افسانوی مجموعہ)1993،اُڑان کا موسم(غزلوں کا مجموعہ)۔2008، پابرہنہ (زیرِطبع)،صحرادشت بدن(زیرترتیب)

نمونہ کلام درج ذیل ہے

استادہ شاخ ہے جو جھک نہیں سکتی جھکانے سے
یہ ممکن ہے کہ اک دن ٹوٹ جائے آزمانے سے
مرے اندر ڈراموں کا بسوں کا شور رہتا ہے
کبھی یہ دل دھڑکتا تھا کسی کے آنے جانے سے

بلا سے ہاتھ نہ آئے کلید فکر سخن
میں شعر کہتا ہوں جب بھی تو اپنی ہی کٹ کا

نیا لہجہ غزل کا مصرعِ ثانی میں رکھا ہے
ہوا کو مٹھیوں میں آگ کو پانی میں رکھا ہے

رنگ آواز سے روشن جنگل کر دینا
حد نظر تک بادل بادل کر دینا
اچھے خاصے لڑکے کو،اک لڑکی کے
بائیں ہاتھ کا کھیل ہے پاگل کر دینا
اب اس کا مفہوم تو اہل دل جانیں
چھو کر اس کے جسم کو صندل کر دینا
کبھی تو ہو شاداب بصیرت کا جنگل
بعد میں سارے منظر اوجھل کر دینا
میری جڑمیں تیرا ہی تو پانی ہے
میری سوکھی ڈال میں بھی پھل کر دینا

شہاب ظفر اعظمی

شہاب ظفر اعظمی ولد عبدالبر اعظمی تعلیمی سند کے اعتبار سے یکم اپریل 1972 کو گیا میں پیدا ہوئے۔ والد عالم دین تھے اور انھیں کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ 1990 میں مگدھ یونیورسٹی سے بی-اے آنرس (اردو) کا امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی چلے گئے۔ جامعہ اسلامیہ سے 1993 میں بی-ایڈ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایم-اے اردو (1996) کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 2006 میں مگدھ یونیورسٹی سے ''اردو ناول کے اسالیب: ایک تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی دوران جون 2003 میں وہ پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہوگئے جہاں فی الحال اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

شہاب ظفر اعظمی کی کم از کم دو ادبی جہتیں نمایاں ہیں۔ ایک کا تعلق اردو تنقید سے ہے اور دوسرے کا صحافت سے۔ انھوں نے ہندو پاک کے درجنوں سمیناروں میں اپنی انفرادیت کے ساتھ شرکت کی ہے اور ان کے چار درجن سے زیادہ تحقیقی و تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تنقید نگاری بنیادی طور پر چار پہلوؤں سے عبارت ہے۔ فن پاروں کا اسلوبیاتی مطالعہ، تجزیاتی انداز بیان تعمیری فکر اور فکشن کے جائزے سے ان کی قربت۔ ادبی صحافت

سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے اور میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے 'اردو جرنل' سے ان کی دلچسپی نے پیش کش اور تزئین وترتیب کے اعتبار سے اس کو پوری اور دنیا میں ایک پہچان عطا کی ہے۔ ان کی کتابوں پر اتر پردیش اور بہار کی اردو اکادمیوں سے انعامات مل چکے ہیں۔ ساتھ ہی بہار اردو اکادمی سے کلیم الدین احمد ایوارڈ (2012) اور علمی مجلس پٹنہ کی جانب سے عبدالمغنی ایوارڈ بھی حاصل ہو چکا ہے۔

اب تک ان کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں:

1- ضیائے اشرفیہ (1990)
2- اسلام کا معاشرتی نظام (1992)
3- اردو کے نثری اسالیب (1999)
4- فرات: مطالعہ، محاسبہ (2004)
5- اردو ناول کے اسالیب (2006)
6- جہان فکشن (2008)

درج ذیل کتابوں کے زیر اشاعت ہونے کی اطلاع ہے:

بہار میں جدید اردو ناول
اردو خاکہ نگاری
متن اور معنی

صبیح عمادی

سید شاہ محمد صبیح الحق (قلمی نام: صبیح عمادی) ابن سید شاہ حبیب الحق عمادی 8/ رمضان المبارک 1319ھ (بمطابق 1901) کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ نانیہالی رشتے سے آپ کا سلسلہ نسب مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ بہار شریف سے ملتا ہے۔ آپ نے مدرسہ الٰہیات کانپور سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ 1925 میں آبگلہ (گیا) کے سید شاہ مظہر امام کی بڑی صاحبزادی سے شادی ہوئی جن سے دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے متین الحق عمادی نے آپ کا کلام پہلی بار 1981 میں ''نقوش صبیح'' کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ایک لغت اور چند منقبت کے علاوہ غزلیں اور رباعیات شریک اشاعت ہیں۔ مرتب نے حضرت عماد الدین قلندر سے لے کر حضرت صبیح الحق عمادی تک اس سلسلے کے تمام بزرگوں کے حالات بھی خاصی تفصیل سے لکھے ہیں۔ 'تعارف' کے عنوان سے سید رضی الدین احمد، سابق ممبر یونیورسٹی سروس کمیشن بہار نے ان کی شاعری پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت صبیح نے مجاز میں حقیت کے رنگ کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے ان کی ظاہراً مجازی شاعری کا ڈانڈا حقیقت سے مل جاتا ہے یعنی بتوں کو گو بظاہر چاہتا ہوں حقیقت میں یہ چاہت ہے خدا کی

حسن اتفاق سے راقم الحروف کو بھی شاہ صبیح الحق عمادی سے کئی بار ملنے اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موصوف کی شاعری میں ان کی سادہ مگر سحر انگیز شخصیت کا عکس موجود ہے۔ عام طور پر وہ بے حد کم سخن تھے اور ایک خوشگوار مسکراہٹ ہر مخاطب کے لیے ان کے ہونٹوں پہ موجود رہتی تھی۔ ان کی شاعری میں بھی اس شگفتگی اور کھلے پن کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صبیح الحق صاحب اپنے والد کی وفات کے بعد 1942 (1361ھ) میں سجادہ عمادیہ پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس موقع پر تمنا عمادی کا کہا گیا ایک قطعہ بہت مقبول ہوا جو رسالہ "ندیم" گیا جنوری 1942 کے شمارے میں موجود ہے۔ تقریباً بتیس سال سجادہ نشیں رہنے کے بعد 1974 سے آپ کی بیماری کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر 7 رفروری 1975 (بمطابق 24 محرم الحرام 1395ھ کو ان کی وفات تک جاری رہا۔ انتقال کے بعد حسب روایت جنازہ پا پیادہ پٹنہ سیٹی سے پھلواری شریف لے جایا گیا جہاں قبرستان لال میاں کی درگاہ میں آسودۂ خاک ہوئے۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے

خاکساری سے ملا کرتا ہے رتبہ کیسا
پسِ کے عزت کو پہنچ جاتا ہے سرمہ کیسا

واعظو حرمت مئے کا ہے یہ چرچا کیسا
تم نے رندوں سے نکالا ہے یہ بدلا کیسا

ہم غلامان محبت اسے کیا جانیں بھلا
دیر کہتے ہیں کسے اور ہے کعبہ کیسا

جان کو روگ محبت کا لگایا ہم نے
ہائے دل دے کر خریدا ہے یہ سودا کیسا

کس طرح ہو ترے در سے دل دیوانہ جدا
شمع سے ہو نہیں سکتا کبھی پروانہ جدا

قیس مشہور ہوا ہم نے لیا ضبط سے کام
اس کا افسانہ جدا ہے مرا افسانہ جدا

ظاہر میں اگر دلربا ہے دنیا
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہے دنیا

پھندے میں نہ اس کے کبھی آنا اے دل
آفت ہے مصیبت ہے، بلا ہے دنیا

صابر آروی

سید صابر حسین ابن سید خادم حسین تعلیمی سند کے مطابق 2/جنوری 1933 کو (عاشور کاظمی نے سال پیدائش 1928 لکھا ہے) آرہ شہر (پٹنہ سے تقریباً ساٹھ کیلومیٹر دور) کے محلہ مہادیوا میں پیدا ہوئے۔ آبائی شہر کی مناسبت سے قلمی نام صابر آروی اختیار کیا مگر زندگی کا زیادہ تر حصہ پٹنہ میں گذرا۔ ٹاؤن ہائی اسکول آرہ سے میٹرک کرنے کے بعد بی۔این۔کالج پٹنہ سے بی۔اے اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (پالٹیکل سائنس) کے امتحانات پاس کیے اور 1969 سے حکومت بہار کے محکمۂ مالیات میں ملازم ہوگئے۔ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں وقفہ وقفہ سے باہر بھی جانا پڑا مگر زندگی کے آخری پندرہ بیس سال پٹنہ کے ہی سری کرشنا پوری محلے میں گذرے۔ 9/اکتوبر 2009 کو پاٹلی پترا کالونی کے سہیوگ نرسنگ اسپتال میں آخری سانس لی۔ میت آرہ لے جائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ پسماندگان میں اہلیہ ساجدہ خاتون کے علاوہ چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

سید صابر حسین کو ابتدا سے ہی ایک علمی و ادبی ماحول میسر ہوا۔ بقول بہزاد فاطمی ان کے اجداد میں ایک بزرگ شاعر قمر آروی (شاگرد صفیر بلگرامی) نے ''سراج و منہاج'' کے نام سے طویل مثنوی لکھی تھی جو 1893 میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے والد خادم آروی مشہور غزل گو شاعر تھے جو ''شاد منزل'' کے

مشاعروں میں برابر شریک ہوتے تھے (مقدمہ سرمایۂ احساس)۔ ایسے میں صابر کا شعروادب کی طرف متوجہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ انھوں نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اور معروف شاعر سید کاظم حسین زار کی شاگردی اختیار کی۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ 1985 سے صنف مرثیہ اور قصیدہ پر بھی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے رہے۔ پڑھنے کا ایک مخصوص انداز تھا جس کے سبب مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بہت مقبول تھے۔ ادبی خدمات کے لیے انھیں بہار اور بنگال اردو اکادمی کے علاوہ بھارتیہ بھاشا پریشد (کلکتہ) اور ساہتیہ سنسد (سمتی پور) کے انعامات حاصل ہوئے۔

سید عاشور کاظمی کا خیال ہے کہ جوش کی طرح صابر آروی بھی کربلا کو ایک درس گاہ اور مکتبہ فکر تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''صابر آروی کے قصائد کو پڑھ کر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے قصائد کو فکر کے رنگوں سے سنوارا ہے۔ صابر آروی کی مرثیہ گوئی میں بھی ایک بہت ہی اہم اور جداگانہ پہلو یہ ہے کہ بین کے حصے میں رونے رلانے کی فضا پیدا کرتے وقت انھوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خاندان رسالت کی خواتین کا کردار مجروح نہ ہو۔''

صابر آروی کی تصنیفات درج ذیل ہیں۔ جن کے علاوہ چند مراثی غیر مطبوعہ بھی ہیں:

1۔ سرمایۂ احساس (1992)
2۔ روپ اور دھوپ (بہ زبان ہندی 1994)
3۔ متاع احساس (1996)
4۔ گنجینہ عرفاں (مجموعہ مراثی، 1996)
5۔ سفینہ عرفاں (مجموعہ مراثی، 1997)
6۔ آئینہ عرفاں (مجموعہ مراثی، 1998)

نمونہ کلام درج ذیل ہے:

یہ کم نہیں کہ آپ کی محفل میں میرے بعد — عنوان بدل بدل کے مری داستاں رہی
ہونے لگے ہیں اہل نظر اب جنوں نواز — اہل خرد تمھارے شبستاں کی خیر ہو

کربلا صاحب ایماں کے لیے فکر جمیل — کربلا کرتی ہے افسانۂ دل کی تکمیل
کربلا ذہن کی آسودہ مزاجی کی کفیل — ہے اندھیرے کے لیے رحمت حق کی قندیل
اہل ایماں کو بصیرت کی ضیا ملتی ہے
اس چمن زار میں خوشبوئے وفا ملتی ہے

صفدر امام قادری

صفدر امام قادری ولد شرف الدین احمد کی پیدائش بتیا (مغربی چمپارن) میں تعلیمی سند کے اعتبار سے 28/اگست 1965 کو ہوئی۔ ان کے والد بھی ادیب و شاعر تھے اور ان ہی کی زیر نگرانی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم۔اے (اردو) کا امتحان پاس کیا اور فی الحال شعبۂ اردو کالج آف کامرس پٹنہ میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ صفدر امام قادری شاعر بھی ہیں اور تنقید نگار بھی، صحافت سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ وہ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ظفر مجیبی کے مطابق انھوں نے شاعری کا آغاز 1983 سے کیا۔ وہاب اشرفی کا بیان ہے کہ وہ 1984 سے مضامین بھی لکھ رہے ہیں اور شاعری بھی کر رہے ہیں۔ وہاب صاحب نے لکھا ہے:

> ''اب تک ان کے چالیس سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور دونوں زبانوں میں چار چار کتابیں مرتب کی ہیں ایک کتاب ''صلاح الدین پرویز کا آئیڈنٹی کارڈ'' 1994 میں شائع ہوئی تھی۔ ادھر ان کی نظمیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی نظموں کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے

پچیس نظمیں صرف ''بادل'' کے عنوان سے قلمبند کی ہیں۔ ان کا رومانی تیور بڑا دلکش ہے۔ صفدر امام گر اپنے آپ کو کنٹین کریں اور اپنی تنقید میں زیادہ مثبت انداز اختیار کریں تو شعر و ادب میں ان کی جگہ از خود محفوظ ہو جائے گی۔'' (تاریخ ادب اردو ۔جلد سوم۔طبع اول ص 1887)

میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران صفدر امام قادری نے چند ایسے تبصرے قلم بند کیے ہیں جنہیں بھرپور تجزیاتی مضامین کا نمونہ کہا جا سکتا ہے اور ان میں استدلال کا ایسا انداز ہے جس کے آگے خیال آرائی نہیں ٹھہرتی۔ گرچہ ان میں ایک نوع کی جارحیت کا اساس ہوتا ہے جس کی جگہ ہمدردانہ مطالعہ کو دی جاتی تو بہتر تھا۔

صفدر امام شاعر بھی ہیں اور انھوں نے خوبصورت نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔

نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہے:

ہمارے مشترک احساس کا منظر بھلاوا ہے
یزیدی گردنوں پر خاک اور خنجر بھلاوا ہے
پرندے گھونسلوں سے دور اب آکاش میں جائیں
زمیں کی مامتا کیا ہے، مقدر گر بھلاوا ہے
ہم اب کے خشک سالی پر قناعت کر نہیں سکتے
لہو کی فصل سے دھرتی ہوئی بنجر بھلاوا ہے
سڑک کے حادثے میں ہم بھی اک دن ڈھیر ہو جائیں
یہ غزلیں، شعر اور دفتر، میاں صفدر بھلاوا ہے

طلحہ رضوی برق

سید محمد طلحہ رضوی (تاریخی نام سید ناصر رضوی اور تخلص برق) ولد سید شاہ محمد قائم قتیل داناپوری کی تاریخ پیدائش تعلیمی سند کے مطابق 25 رجنوری 1941 ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ نے ابتدائی دینی تعلیم والد محترم اور والدہ بی بی محمودہ خاتون کی نگرانی میں حاصل کی۔ 1955 میں بلدیو اہائی اسکول سے میٹرک اور 1957 میں بی۔ ایس کالج، داناپور سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ 1960 میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے۔ آنرس، 1962 میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو اور 1963 میں ایم۔ اے فارسی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ 1970 میں اسی یونیورسٹی سے ''شاہ اکبر داناپوری حیات و خدمات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی لکھا اور 1979 میں ڈی۔ لٹ (فارسی) کیا۔ 1977 میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی سے سی۔ او۔ پی (فارسی) کی ڈگری حاصل کی اور 1996 میں جدید فارسی زبان و ادب کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ایران بھی گئے۔ مارچ 1963 میں نالندہ کے موضع مہوٹی کے مولوی منظور احسن صدیقی کی صاحبزادی بی بی زیب النساء سے شادی ہوئی اور 1970 میں پہلی بار حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد 2002، 2004 اور 2008 میں بھی حج کے لیے تشریف لے گئے۔ 2003 میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اولادوں

میں چار بھائی سید شاہ بلال رضوی، شاہ سلمان رضوی، شاہ جنید رضوی اور ابوذر سعد رضوی نیز چار بہنیں خوش حال اور سرگرم کار ہیں۔ آپ پہلی بار 1963 میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے مرکزی حکومت کے ڈیفنس اکاؤنٹس میں ملازم ہوئے مگر چند ہی ماہ کے بعد نوادہ کالج، نوادہ میں تقرر ہو گیا۔ وہاں بھی زیادہ دن تک نہیں رہے اور بہار پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر ستمبر 1963 سے ایچ۔ ڈی۔ جین کالج، آرہ (مگدھ یونیورسٹی) میں اردو و فارسی کے لکچرر ہوئے۔ ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے عہدے تک پہنچ کر 13 رجنوری 2001 کو ویر کنور سنگھ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے۔ والد محترم سید شاہ قتیل داناپوری کی وفات کے بعد 1985 میں آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ داناپور کے سجادہ نشیں ہوئے اور اب تک اس منصب پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کی ایک اسکیم کے تحت دہلی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

طلحہ رضوی برق نے جس ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولی وہ ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ انھوں نے 53-1952 سے ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا اور والد محترم سے اصلاح لینے لگے۔ چند ہی برسوں میں ان کا کلام کئی اہم رسالوں میں مسلسل شائع ہونے لگا۔ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور ان کے چند علمی و ادبی مضامین ''نگار'' لکھنؤ اور ''نوائے ادب'' بمبئی جیسے رسالوں میں منظر عام پر آئے۔ ان کی مختلف کتابوں پر اب تک اتر پردیش، بہار اور بنگال کی اردو اکادمیوں سے انعام مل چکا ہے۔ علمی و ادبی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے 2004 میں لندن اور 2005 میں پاکستان بھی جا چکے ہیں۔ اردو اور فارسی ادب پر ہونے والے متعدد قومی اور بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں میں آپ نے مقالے پڑھے ہیں یا صدارت کی ہے۔ اب تک آپ کی درج ذیل کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

1۔ اردو کی نعتیہ شاعری (جنوری 1974)
2۔ غور و فکر (تنقیدی مضامین 1976)
3۔ نقد و بخش (تنقیدی مضامین 1982)
4۔ شاہ اکبر داناپوری (تحقیق 1985)
5۔ شایگاں (مجموعہ کلام 1989)
6۔ ارزش ادب (تنقیدی مضامین 1995)

7۔ شہاب سخن (مجموعہ رباعیات 1996)۔اس کتاب کا ایک اڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے۔
8۔ قطعۂ تاریخ (بہ زبان فارسی 2007)
9۔ اربعین (نعتیہ مجموعہ 2008)
10۔ سہرے ہی سہرے (2008)
11۔ عشرہ مبصرہ (تبصروں کا مجموعہ 2009)
12۔ Mysticism in our poetry (بہ زبان انگریزی 1984)

ان کی مرتب کردہ کتابیں درج ذیل ہیں:

1۔ گلستان سخن محمودہ (مجموعہ نعت بی بی محمودہ خاتون 1956)
2۔ تجلیات قتیل (دیوان اردو 1956)
3۔ خورشید سحر (دیوان فارسی علامہ قتیل داناپوری 1968)
4۔ ضیاالعروض از قتیل داناپوری 1986

ان کے علاوہ درج ذیل کاموں کے تشنۂ طباعت رہنے کی اطلاع ہے:

1۔ تذکرہ شعرائے داناپور
2۔ عرفان سخن سرائے بہار (فارسی)
3۔ آئینہ تصوف
4۔ افکار جمیل بہ تذکرہ قتیل
5۔ قاموس تاریخ گوئی
6۔ منتشرات (نظموں کا مجموعہ)
7۔ افصح التواریخ (اردو و فارسی)

طلحہ رضوی برق ہندو پاک کے علمی حلقوں میں شاعر اور تنقید نگار دونوں ہی حیثیتوں سے خاصے معروف و مقبول ہیں۔نعت پاک اور قطعہ تاریخ لکھنے میں انھیں انفرادیت اور ملک گیر شہرت حاصل ہے۔غزلوں میں فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے اثرات نمایاں طور پہ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔''اردو نعتیہ شاعری'' کے نام لکھی گئی ان کی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ابتدائی چند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جہاں تک ان کے تنقیدی مضامین کا تعلق ہے، میں نے نقد و سنجش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے

(رسالہ آج کل، دہلی جون 1986) لکھا تھا:

''اس کتاب کے بیشتر مقالے ایک مشرقی تناظر رکھتے ہیں اور تحقیق و تنقید کا اچھا معیار پیش کرتے ہیں..... انداز بیان بڑا دل کش اور بلیغ ہے۔''

میں ان کی تنقید نگاری کے بارے میں اب بھی اس رائے پر قائم ہوں۔ برق کا نمونہ کلام درج ذیل ہے:

حمد کے اشعار

قوس قزح کے رنگ میں تو — پیکر شوخ و شنگ میں تو
انت الہادی، انت الحق — امن و صلح و جنگ میں تو
لیس الہادی الا اللہ — ہر ممکن فرہنگ میں تو
لامقصود الا اللہ — جینے کے ہر ڈھنگ میں تو

نعت کے اشعار

کب ان کی یاد میں نقش حجاب اٹھ جائے — نگاہ شوق کو اشکوں سے باوضو رکھنا
دیار قدس میں ہر جا ہیں نقش پائے حضور — جبین شوق کو سجدے میں کو بہ کو رکھنا
حسین منّی انا من حسین کے غم میں — جو حق شناس ہو دل کو لہو لہو رکھنا

غزل کے دو اشعار

اشک جب قطرہ خوں ہو تو غزل ہوتی ہے — ضبط غم حد سے فزوں ہو تو غزل ہوتی ہے
عشق کی آگ میں جل جائے متاع ہستی — برق کہتا ہے کہ یوں ہو تو غزل ہوتی ہے

ظفر اوگانوی

سید محی الدین (قلمی نام ظفر اوگانوی) ابن قاری سید فصیح احمد جن کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش سے متعلق متضاد بیانات ملتے ہیں مگر مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ وہ یکم جنوری 1939 بروز جمعہ بمطابق 2 رشوال المکرم 1354ھ سرونج (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد درس و تدریس اور تبلیغ دین کے کاموں میں مشغول تھے۔ 1949 میں وہ والد کے ساتھ استھانواں (موجودہ ضلع نالندہ) آگئے اور کچھ دنوں یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدی سے فاضل کیا اور دوبارہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے 1959 میں پاس کیا۔ رام موہن رائے سمینری سے آئی۔اے اور پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرس اور ایم۔اے اردو کے امتحانات پاس کرنے کے بعد 1967 میں علامہ جمیل مظہری کی نگرانی میں ''صفیر بلگرامی حیات اور کارنامے'' پر پی۔ایچ۔ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھا جس کے ممتحن پروفیسر احتشام حسین اور سید نجیب اشرف ندوی ہوئے۔ غرض یہ کہ دینی اور دنیاوی علوم کا متوازی سلسلہ جاری رہا جس سے فراغت کے بعد سب سے پہلی ملازمت پٹنہ سیٹی کے جارج مڈل اسکول میں کی۔ اس کے بعد تقریباً تین برسوں تک پٹنہ کے ہی بی۔پی۔ایس۔ کالج میں لکچرر ہوئے۔ اسی دوران 30 مئی 1964 کو اوگانواں (موجودہ ضلع

نالندہ) کے ایک زمیندار گھرانے میں قاضی سید عین الحق کی منجھلی لڑکی روشن آرا سے ان کی شادی ہوگئی جو شادی کے بعد روشنی ظفر کی صورت میں ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔ فروری 1969 سے وہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ جولائی 1979 میں ریڈر اور جنوری 1986 میں پروفیسر ہوئے۔ بالآخر دوران ملازمت ہی 21 رجون 1996 کو ان کا انتقال ہوا اور گوبرا قبرستان نمبر 2 (کلکتہ) میں مدفون ہوئے۔ درمیان میں کچھ وقفے کے لیے ممبر مغربی بنگال کالج سروس کمیشن (1991 سے) اور چیرمین مغربی بنگال اقلیتی کمیشن بھی رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں ''ظفر اوگانوی: حیات و خدمات'' کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی لکھا جا چکا ہے۔

اردو ادب میں ظفر اوگانوی کی بنیادی خدمات ان کی افسانہ نگاری سے عبارت ہیں۔ وہ عام طور پر جدیدیت کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں مگر پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ بیانیہ سے جدیدیت تک اور پھر واپسی کے سفر میں ان کی افسانہ نگاری کئی نشیب و فراز سے گزری۔ اور مختلف ادوار میں ان کے افسانوں کے موضوعات بدلتے رہے۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا پہلا افسانہ رسالہ ''صنم'' پٹنہ میں 1958 میں شائع ہوا تھا۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''بیچ کا ورق'' 1977 میں شائع ہوا اور اس پر مثبت و منفی آرا کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ وہ ایک تنقید نگار اور محقق کی حیثیت سے بھی معروف رہے ہیں۔ صفیر بلگرامی سے متعلق ان کا تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے اور معیاری تحقیق کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ایک تالیف جلوۂ خضر کی تلخیص و تنقید کی شکل میں منظر عام پر آ چکی ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص ادبی نظریات کی آئینہ داری کے لیے ''اقدار'' نام کا ایک رسالہ بھی پٹنہ سے جاری کیا تھا مگر اس کے چند ہی شمارے نکل سکے۔ مجموعی طور پر ایک جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت اور اہمیت اب بھی برقرار ہے۔

ظفر صدیقی

محمد ظفر (قلمی نام: ظفر صدیقی) ولد محمد ناظم تعلیمی سند کے مطابق 11 / اکتوبر 1956 کو موضع پوکھریرا، سیتامڑھی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے ترک وطن کے بعد محلہ خلیل پورہ پھلواری شریف میں سکونت اختیار کر لی جہاں ظفر صدیقی گذشتہ پچیس برسوں سے مقیم ہیں۔ ظفر کی تعلیمی استعداد انٹر پاس ہے مگر ابتدائے عمر سے ہی علم وادب کی اس شاندار روایت سے انھیں استفادہ کرنے کا موقع ملا جو معروف ادیبوں اور شاعروں کی ایک چھوٹے سے قصبے میں موجودگی کی مرہون منت تھی۔ ان کی دلچسپی کا محور شاعری کے علاوہ صحافت ہے۔ دینی رجحان اور مزاج کے سبب ان کی شاعری کا ایک خاص انداز رہا ہے۔

2008 میں ظفر صدیقی کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جو ان کی قادر الکلامی فنی پختگی اور ندرت بیان کا احساس دلاتی ہیں ایک ''بعد از خدا'' جو نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے اور دوسرے ''لہجہ ہمارا'' جو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے مجموعے کی ابتدا میں ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے ''ظفر صدیقی کی نعتیہ شاعری'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''نعت گوئی کے لیے پہلی شرط حبِ رسولؐ اور دوسری شرط عظمت رسولؐ کا واضح تصور ہے۔ ظفر صدیقی ان شرطوں پر پورے اترتے ہیں۔ جن کے ثبوت میں ان کے وہ

اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں عشق رسول کی حدّت وشدت بھی ہے اور طہارت ونفاست بھی۔ ندرت فکر وخیال بھی ہے اور جدت اسلوب وادا بھی۔''

میں نے ان کی غزل گوئی کے حوالے سے ''لہجہ ہمارا'' کی تعریف رونمائی میں ایک مختصر سا مضمون پیش کیا تھا جس میں ان کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا اس کو اختصار کے ساتھ یہاں نقل کرتا ہوں:

''ان کی غزلوں میں جس تواتر کے ساتھ ان کی اپنی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے وہ کوئی عام رویہ نہیں ہے..... پھر یہ بھی ہے کہ ظفر اپنے بعض مخصوص جذبوں کو عمومی جہت عطا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں اور آپ بیتی کے آئینے میں جگ بیتی دکھاتے ہیں..... ظفر صدیقی کی غزلوں کا دوسرا امتیاز ان کا براہ راست اور بلند آہنگ اسلوب ہے۔ عام طور سے وہ اپنے احساسات وتجربات کو بے حد سادہ، براہ راست اور واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اتنے واضح انداز میں کہ شاعری میں دلکشی کے لیے ابہام اور Ambiguity کو ضروری قرار دینے والوں کے لیے ایک چیلنج بن جاتے ہیں۔''

نمونہ کلام کے طور پر ان کے چند اشعار نقل کرتا ہوں جو Angry young Man والے منفرد رویے کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

سبھوں سے مختلف جذبہ ہمارا — الگ تیور الگ لہجہ ہمارا
ہم اس پتھر کو پانی کر چکے ہیں — یہاں جو روکتا رستہ ہمارا
تمہارے سر نہ آتی یہ مصیبت — اگر تم مانتے کہنا ہمارا
دی فطرت میں اپنی کج کلاہی — اترتا ہی نہیں نشہ ہمارا

وہ میرا ملنے والا تھا، میں اس سے جھک کے ملتا تھا — جو بات آئی انا کی سر کو اونچا کر لیا میں نے

دوستو تم ہو اگر چشم عنایت والے — ہم بھی کچھ کم نہیں، خود دار طبیعت والے

وہ بزدل جسم پر اپنے قبائے گل سجاتا ہے — جسے زخموں سے تزئین بدن کرنا نہیں آتا

ظفر کا تخلیقی سفر جاری ہے اور وہ ایک زود گو شاعر ہیں اس لیے ان سے بہت جلد مزید شعری مجموعوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

عبدالمجید شمس

سید عبدالمجید (تخلص شمس) ابن سید اظہر حسین مرحوم 20 رجنوری 1905 کو شاہو بیگہہ (ضلع گیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں گھر ہی پہ مکمل کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے (جغرافیہ) کا امتحان پاس کیا۔۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔ اور لندن سے پی-ایچ ڈی کرنے کے بعد پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی میں برسوں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ پھر صدر شعبۂ جغرافیہ کے عہدے تک پہنچے۔ کالج آف کامرس پٹنہ کا آغاز ہوا تو وہاں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے ۔ کچھ عرصے تک اپالچیلن یونیورسٹی امریکہ (وزیٹنگ پروفیسر) اور یونیورسٹی آف کنٹکی (امریکہ) سے بھی وابستہ رہے۔ 2 رجنوری 1983 کو وفات پائی اور شاہ گنج پٹنہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

عبدالمجید شمس عظیم آبادی کی ادبی زندگی کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں ہی ہوا۔ یہ ان کی طالب علمی کا دور تھا۔ مگر اپنی پختہ فکر اور زبان و بیان پہ قدرت کے سبب علامہ فضل حق آزاد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اور بعض علمی و سائنسی نکات کو شاعری کے پیکر میں پیش کر کے اپنا انفرادی رنگ سخن قائم کیا۔ ان کی زیادہ تر غزلیں معاصر (پٹنہ) اور آج کل (دہلی) میں شائع ہوئی ہیں۔ ویسے انھوں نے رباعیاں اور نظمیں بھی کہی ہیں جو فنی مہارت کا نمونہ ہیں۔ مگر ان کی انفرادیت، عظمت، اور شہرت کا اصل سبب ان کی مثنوی ''حیات و کائنات'' ہے۔ تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل یہ مثنوی اردو میں اپنی

نوعیت کی واحد مثنوی ہے جس کا موضوع انسانی ارتقا کا سائنسی تصور ہے۔ ان کی مثنوی نگاری سے متعلق کئی اہم مضامین رسالہ ''زبان وادب'' پٹنہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

1۔ رباعی:

دنیا میں ہے غم تو شادمانی بھی ہے
محرومی ہے گر تو کامرانی بھی ہے
رک جائے قدم نہ رہ نورد ہستی
صحرا میں سراب ہے تو پانی بھی ہے

2۔غزل کے دوشعر:

تم نے جن شمعوں کو بجھایا ہے — آسماں ان سے جگمگایا ہے
رات بھر ہجر میں گماں یہ رہا — سامنے میرے کوئی آیا ہے

3۔ مثنوی حیات وکائنات کے چند اشعار:

ساقی مجھے جام جم میں دے مئے — آجائے نظر میں تاکہ ہر شئے
کھل جائیں سبھی رموز ہستی — معلوم ہو سب فراز و پستی
اسرار بتاؤں زندگی کے — افسانے سناؤں زندگی کے
اس تذکرۂ جہاں سے پہلے — کرتا ہوں بیان چند نکتے
سائنس کا کلیہ رہے یاد — ہوتی نہیں کوئی شئے بھی برباد
صورت ہر آن نت نئی ہے — جوہر وہی مادہ وہی ہے
گرمی سے، دباؤ سے، نمی سے — خلطِ اجزا سے روشنی سے
ہر آن بدل رہی ہے ہر شے — قدرت کا نظام ہی یہی ہے
ہر شئے کی نمود عارضی ہے — دنیا کا وجود عارضی ہے
بکھریں گے جو ذرّے اس جہاں کے — کیا ان سے بنے گا کون جانے

عبدالمجید شمس کی درج ذیل تصانیف شائع شدہ ہیں:۔

مثنوی حیات وکائنات (1956) مثنوی جلوۂ صد رنگ (1970) بزم و رزم فطرت (مجموعہ کلام) (1979) مثنوی یادوطن (1980)۔

ان کے علاوہ اردو اور ہندی میں جغرافیہ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

عظیم الدین مخمور

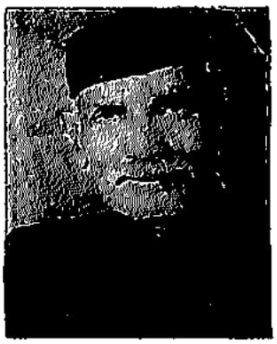

عظیم الدین (تخلص مخمور) ولد نسیم الدین پٹنہ سیٹی کے محلہ کوچہ روشن علی نزد کچی گھاٹ میں 1901 میں پیدا ہوئے۔ صرف گیارہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری والدہ بی بی زیب النسا اور دادا عبداللہ کے سر آپڑی۔ چونکہ نانیہال اور دادا یہال کے اکلوتے صاحبزادے تھے اس لیے لاڈ پیار میں پرورش ہوئی اور اچھی تعلیم کے لیے 1910 میں پٹنہ سیٹی اسکول میں داخلہ کرایا گیا مگر تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور 1926 میں سید عبدالرحمٰن (محلہ خانقاہ، بہار شریف) کی صاحبزادی ماجدہ بیگم سے شادی ہوگئی جن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر شکیب ایاز (اصل نام شیر اسلام) نے ''کلیات سید'' (مطبوعہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ 2009) میں تفصیل سے ان کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اور انھیں سید عظیم آبادی کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ قیاس ہے کہ 1920 کے آس پاس غزل گوئی شروع کی اور اپنے مخصوص رنگ سخن اور ترنم کے سبب جلد ہی مشاعروں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ان کے ارادت مندوں اور شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا مگر زیادہ تر کلام 1947 کے فسادات میں ضائع ہوگیا۔ 4 رمئی 1988 کو وفات پائی اور دوسرے دن بوقت ظہر جامع مسجد شاہ کی املی سے ملحق قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

مرے قالب سے جاں ارمان میرے دل سے نکلے گا
ستم گر جب قدم تیرا، تری محفل سے نکلے گا
اکھڑ جائیں گے سب کے پاؤں اے دل، یہ وہ کوچہ ہے
محبت میں کوئی ثابت قدم مشکل سے نکلے گا

ہم تڑپ کر رہ گئے ابروئے قاتل دیکھ کر
مسکرا اٹھا وہ ظالم ہم کو بسمل دیکھ کر

ہم کو تو چپ لگ گئی مخمور اس کے سامنے
بھولے اپنا مدعا وہ روئے قاتل دیکھ کر

واپس نہ آؤں زندگی مستعار تک
یارب جو ہو رسائی مری کوئے یار تک

ڈرتا نہیں ہوں جھونکوں سے بادسموم کے
چھوڑوں گا میں نہ باغ، امید بہار تک

علیم اللہ حالی

سید علیم اللہ (قلمی نام علیم اللہ حالی) ولد سید احمد تعلیمی سند کے اعتبار سے 17 رجون 1941 کو بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔ دادا ابو صالح سید عبد اللہ حافظ مشکی پوری اپنے زمانے کے مستند شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی نگرانی میں حالی کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کے بعد پورنیہ مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ 1957 میں اسی شہر سے میٹرک پاس کیا۔ 1961 میں بی۔اے آنرس کرنے کے بعد 1963 میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر اردو شاعری کے موضوع پر 1987 میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ کچھ دنوں شعبۂ اردو ایچ۔ڈی جین کالج آرہ (اس زمانے میں مگدھ یونیورسٹی سے ملحق) میں لکچرر رہے۔ پھر گیا میں تبادلہ ہوگیا اور مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے پروفیسر شعبۂ اردو کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ یکم اکتوبر 1967 کو سر سید فخر الدین کی نواسی اور سید صدر الہدیٰ کی صاحبزادی زینت خاتون سے شادی ہوئی جس کے سبب پٹنہ سے مستقل رشتہ استوار ہوا۔ فی الحال پرانے فخر الدین ہاؤس کی جگہ تعمیر شدہ اپارٹمنٹ کے ایک فلیٹ میں مقیم ہیں۔ اور مختلف طرح کے علمی و ادبی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ صحافت سے چونکہ ابتدا سے ہی لگاؤ رہا ہے اور وفا ملک پوری (مرحوم) کے ساتھ ماہنامہ ''صبح نو'' کی ادارتی ذمہ داریاں نبھاتے رہے ہیں، اس لیے ان دنوں بھی

ایک ادبی رسالہ ''انتخاب'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ مزید برآں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن سنٹر کے وزیٹنگ فیلو بھی ہیں۔

صحافت سے قطع نظر ان کی ادبی خدمات کی دو واضح جہتیں ہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے وہ ہند و پاک کی ادبی دنیا میں خاصے معروف ہیں اور ان کے شعری مجموعے ''سفر جلتے دنوں کا''، 'نخل جنوں، اور 'لفظ، آواز، صورت گری' اہم ناقدوں کی نگاہ میں معتبر رہے ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی اور ان دونوں میں ایک بے نام سی اداسی، مایوسی اور محرومی کا احساس نمایاں ہے۔ وہ اگر ایک طرف وقت کی ستم رانیوں کے نوحہ گر ہیں تو دوسری طرف گزرے ہوئے وقت کی سحر کاری کے بھی قائل ہیں۔ مگر انھیں احساس ہے کہ وقت لوٹ کر آنے والی شئے نہیں ہے اور بے پناہی انسان کا مقدر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ احساس صرف ان کا نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی صورت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ ذاتی غم کو بھی اجتماعی درد بنانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ گویا وقت ان کے یہاں ایک تخلیقی محرک اور احساس زیاں ایک جزو غالب کے طور پر موجود ہے اور یہ دونوں نکات انھیں جس تلاش و جستجو کی طرف لے جاتے ہیں اس کا حاصل بھی حیرانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورت ان کی غزلوں سے زیادہ نظموں میں نمایاں رہی ہے۔ ان کی دوسری ادبی جہت ایک ناقد کی ہے۔ تنقیدی مضامین کے بھی تین مجموعے احتساب (1981)، اعتبار (1986) اور فرد و فن (2004) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کا سفرنامہ ''ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے'' 1994 میں اور ساہتیہ اکادمی، دہلی کے لیے لکھا گیا مونوگراف ''پروین شاہدی'' 2000 میں شائع ہوا ہے۔ ''شاخیں'' کے نام سے ایک کتاب 1996 میں چھپی ہے۔ اب بھی وہ ''انتخاب'' اور دوسرے رسائل و جرائد میں تبصرے اور مضامین پابندی سے لکھ رہے ہیں۔ ان کاوشوں پہ نگاہ رہے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ تنقید نگار کی حیثیت سے خاصے بے باک اور غیر جانب دار رہے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی رواں اور شگفتہ ہے جس کے سبب تنقیدی مضامین میں بھی Readibility کی کمی نہیں۔

نمونہ کلام کے طور پر کچھ نظموں کے یہ اقتباسات دیکھے جا سکتے ہیں جو ماضی کی بازیافت میں ناکامی کے سبب لمحۂ حاضر کی بے معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(1) آگ اگلتے موسموں میں
پے بہ پے اٹھتی ہوئی یہ گرد باد
چھینتی جاتی ہے چہروں سے نقوش ہمرہی
ٹوٹتا جاتا ہے ہر لمحہ یہاں

اپنے ہونے کا گماں (نظم سارباں)

(2) کوئی مجھ سے پوچھے کہ آخر
یہ کیا آرزو ہے کہ ٹیبل پہ رکھی
گھڑی کی سوئی یک بیک
اپنی حرکت بدل دے
دبے پاؤں پیچھے چلے
اور پھر چلتے چلتے (نظم: الٹی لہروں کے بہاؤ میں)

(3) مری پشت سے سارے گزرے دنوں
کے مناظر دھواں ہو گئے ہیں
مری پشت پر اب خلاؤں کا اک بوجھ ہے
مرا لوٹ آنا تو ممکن نہیں ہے
یہیں اک جگہ میں رکوں
اور آگے نہ جاؤں
مگر کاش کوئی پکارے نہ مجھ کو (نظم: مستقبل)

ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

گزرا ہر اک شخص مجھے دیکھتا ہوا گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

نکلی ہی تھی کہ شاخ طلب خشک ہو گئی
ہر بار ہم نے ہاتھ سمیٹا بڑھا ہوا
اب اپنی رسم و راہ نئے موسموں سے رکھ
وہ سایہ دار پیڑ خزاں آشنا ہوا

ان پرنئی رتوں کے نشاں بن چکے ہیں آج جن پتھروں پہ نام تھا اپنا لکھا ہوا
ہم کھل کے رو لیے تو کچھ ایسا لگا علیم برسوں کا کوئی قرض تھا جو اب ادا ہوا

عبدالخالق

عبدالخالق ولد محمد نظیرالدین تعلیمی سند کے اعتبار سے 12/ جنوری 1942 کو ایک تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور آمدنی بھی قلیل تھی مگر والدہ قریشہ خاتون نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھیں بلکہ اپنی تنگ دستی کے باوجود بچوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا چاہتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دے کر بھی عبدالخالق کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب ان کے چار بھائیوں کی صغرسنی میں ہی وفات ہوگئی تو ماں باپ کی امیدوں کا واحد سہارا عبدالخالق ہی رہ گئے۔ والد کی تجارت ختم ہوجانے اور ان کے کلکتہ چلے جانے کے بعد دو بہنوں کی ذمہ داری بھی ان ہی پہ آپڑی۔ مگر ان ساری دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے 1963 میں اس۔ کے۔ آر۔ کالج، برگیہا سے بی۔ اے۔ آنرز کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا اور مستقل طور سے پٹنہ میں رہنے لگے۔ پھر 1965 میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد گرو گوبند سنگھ کالج، پٹنہ میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اسی دوران یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جونیر فیلوشپ مل گئی جس کے تحت 1973 تک پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں علامہ جمیل مظہری کے زیرنگرانی ''اردو نثر کے اسالیب: آزاد سے آزاد تک'' کے موضوع پر تحقیقی کام کرتے رہے۔ 1973 کے بعد کچھ دنوں بہار اردو اکادمی میں ریسرچ

اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا اور 1974 میں یو۔پی۔ایس۔سی سے پروگرام ایکوی کیٹو کے عہدے پر منتخب ہوکر آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ میں کام کرنے لگے۔اسی دوران 1980 میں شاہین سلطانہ سے شادی ہوئی جن کا 2010 میں انتقال ہوگیا۔ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد (2002) داناپور (پٹنہ) کے محلہ جمال الدین چک میں نوتعمیر شدہ ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہیں اور 2008 سے مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی پٹنہ سے بھی وابستہ ہیں۔

عبدالخالق میں تحقیق وتنقید کی بہترین صلاحیتیں موجود ہیں۔اگر وہ سرکاری ملازمت کے بجائے درس وتدریس سے وابستہ رہتے تو اردو نثر کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کرسکتے تھے۔گرچہ اپنی گوناگوں مشغولیات کے باوجود انھوں نے جو کام کیا ہے وہ بنیادی نوعیت کا ہے اور اس کی ادبی و لسانی اہمیت کا پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شبیہ الحسن اور پروفیسر شکیل الرحمٰن جیسے مشاہیر نے اعتراف کیا ہے۔ان کی مطبوعہ کتابوں پر بہار اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں سے انعامات بھی حاصل ہوئے ہیں۔جس طرح کے اسلوبیاتی مطالعے انھوں نے کئے ہیں، ان کی روایت اردو میں بہت مختصر ہے۔ان کے بہت سارے مضامین جو ہندو پاک کے اہم رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں، اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔مرکزی حکومت کے شعبۂ ثقافت کی ایک فیلوشپ کے تحت انھوں نے 2003 سے 2005 کے دوران ''مسلم معاشرے میں لوک گیت'' کے موضوع پر کام کیا تھا۔یہ مسودہ بھی تشنہ طباعت ہے۔ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ مقالات سلطان احمد (بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے) 1975

2۔ آثار وافکار (مضامین کا مجموعہ) 1980

3۔ اردو نثر کے اسالیب: آزاد سے آزاد تک (فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے مالی تعاون سے) 1985

عبدالصمد

محمد عبدالصمد ولد محمد شبلی اپنی نانیہال واقع بہار شریف (موجودہ ضلع نالندہ) میں تعلیمی سند کے مطابق 18 رجولائی 1952 کو پیدا ہوئے۔ یہ زمینداروں کا گھرانہ تھا جن کی جائدادیں راج گیر کے اطراف میں واقع ایک مشہور بستی انڈھوس میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے والد اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے۔ مگر انھیں مال و دولت کے ساتھ ساتھ رئیسوں کے شوق بھی وراثت میں ملے تھے اس لیے زمینداری ختم ہونے سے قبل ہی جائداد کی فروخت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو 1970 کے آس پاس اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس دوران عبدالصمد ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کرنے کے بعد والدین کی مرضی کے مطابق قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر چکے تھے۔ مگر بعض اسباب کے تحت اٹھارہ پارے حفظ کرنے کے بعد انھیں اسکول کی تعلیم کی طرف رخ کرنا پڑا اور انھوں نے صغریٰ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں گیا کالج میں سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ واپس بہار شریف آکر 1971 میں نالندہ کالج سے بی۔ اے آنرس اور 1973 میں مگدھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (پالیٹیکل سائنس) کے امتحانات پاس کیے۔ پھر یو۔ جی۔ سی فیلوشپ کے تحت پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ 1979 سے انھیں اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی کے شعبۂ سیاسیات میں ملازمت مل گئی۔ 1996 میں یونیورسٹی سروس کمیشن کی سفارش پر کچھ برسوں تک راج نرائن کالج حاجی پور

میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور 1998 میں استعفیٰ دے کر واپس اورینٹل کالج چلے آئے۔ستمبر 2005 سے 2010 تک وہیں پرنسپل کے عہدے پر کام کرتے رہے۔جنوری 1981 میں ڈاکٹر محمد اقبال ملک گیا کی صاحبزادی افسانہ خاتون سے شادی ہوئی جن سے دو بیٹے فہد اور اشعر ہیں۔موصوفہ خود بھی علم وادب کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ان میں سے اکثر امور کی تفصیل ڈاکٹر محمد ارمان حسین کی کتاب ''عبدالصمد فرد بنام ناول'' (تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی مطبوعہ 2003) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

عبدالصمد کے ادبی سفر کا آغاز بچوں کے لیے لکھی گئی ایک کہانی سے ہوا۔بقول ڈاکٹر ارمان حسین ان کا پہلا افسانہ ''ایک مرغ'' 1967 میں ''آئندہ'' جمشید پور میں شائع ہوا۔اس کے تقریباً چودہ سال بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ اور بیس سال بعد پہلا ناول منظر عام پر آیا۔تاحال ان کی درج ذیل کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

بارہ رنگوں والا کمرہ	(پہلا افسانوی مجموعہ)	1980
پس دیوار	(افسانوی مجموعہ)	1983
سیاہ کاغذ کی دھجیاں	(افسانوی مجموعہ)	1996
میوزیکل چیر	(افسانوی مجموعہ)	2002
آگ کے اندر راکھ	(افسانوی مجموعہ)	2008
دو گز زمین	(پہلا ناول)	1988
مہاتما	(ناول)	1992
خوابوں کا سویرا	(ناول)	1996
مہا ساگر	(ناول)	1999
دھمک	(ناول)	2004
بکھرے اوراق	(ناول)	2010

علم سیاسیات سے متعلق درسی نوعیت کی دو کتابیں

ترجمہ شدہ دو کتابیں:

عبدالصمد اردو کے ان خوش نصیب ادیبوں میں ہیں جن کی ادبی خدمات کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ 1990 میں انھیں ''دو گز زمین'' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا اور اکادمی کی

روایت کے مطابق ہندوستان کی اکیس زبانوں میں اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی حمایت اور مخالفت میں بہت سے مضامین آئے مگر بقول حسین الحق آج ان کا یہ ناول اردو ناول کی روایت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ ان کی دوسری کتابوں پر بھی بہار اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں سے انعامات ملے اور 1998 کا ساہتیہ بھاشا ایوارڈ بھی انھیں حاصل ہوا۔ 1993 سے 1997 تک وہ ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور 1996 - 1994 کے دوران گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کے ممبر رہے۔ حکومت بہار کی ہندی پرگتی کمیٹی کے ممبر اور اردو مشاورتی کمیٹی کے چیرمین (1991 تا 1999) بنے۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا اور بہار یونیورسٹی مظفر پور کی سنڈیکیٹ کے ممبر رہے اور اردو یا اقلیتوں سے متعلق حکومت بہار نیز حکومت ہند کی مختلف کمیٹیوں میں اردو کی نمائندگی کرتے رہے۔ ہندو پاک کے مختلف جریدوں میں ان پر گوشے شائع ہو چکے ہیں اور حال ہی میں ان کی شخصیت اور فن سے متعلق ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ ایک کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی ہے جس میں کم وبیش دو درجن مشاہیر اردو کے مضامین شریک اشاعت ہیں۔

عبدالصمد کے بعض ابتدائی افسانوں پر جدیدیت کے اثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں اور وہ افسانے ایک عرصے تک انھیں عزیز بھی رہے ہیں مگر بہت جلد انھوں نے بیانیہ کی طرف رخ کرلیا ہے اور ان کا یہی انداز اب ان کی شناخت بن چکا ہے۔ عبدالصمد کے ہم عصر حسین الحق نے شعر و حکمت، دور سوم کتاب 7 میں ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھا تھا:

> ''شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے نگاروں سے واقعہ بیان کرنے کی مانگ کی تھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کی اس پکار پر سب سے زیادہ پھر پور طور پر لبیک کہنے والا افسانہ نگار عبدالصمد ہی ہے۔ اس کے 59 فی صد افسانوں میں واقعہ ہی بیان کیا جاتا ہے، ترقی پسندوں کی طرح کردار نگاری یا جدیدیت پسندوں کی طرح دروں بینی عبدالصمد کا شعار نہیں۔''

''شعر و حکمت'' کے اسی شمارے میں ''عبدالصمد کی ناول نگاری'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے طویل مضمون کا اختتام کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

> ''عبدالصمد کے مختلف ناولوں کے انفرادی تجزیے کے بعد چند باتیں ان کے سبھی ناولوں کے حوالے سے کہنے کا دل چاہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے یہاں احتجاج کا ایک ایسا انداز ملتا ہے جو دور حاضر کے بہت کم ناول نگاروں کے یہاں دکھائی دیتا

ہے..... تقسیم ہند سے لے کر آج تک سیاست کے سبب ہماری سماجی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے ہیں ان کی عکاسی دوسرے ناول نگار بھی کرتے رہے ہیں اور چونکہ 'بجلیوں کے زد پر اپنا آشیانہ ہے' اس لیے صدائے احتجاج بلند ہونا ایک فطری امر ہے مگر جذبات پہ قابو رکھنا کل بھی مشکل تھا اور آج بھی مشکل ہے..... یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ عبدالصمد کی صدائے احتجاج (اگر ہے!) شوکت خلیل یا مشرف عالم ذوقی کی آواز سے مختلف ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ عبدالصمد کی ناول نویسی یا افسانہ نگاری کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا ابھی ممکن بھی نہیں چونکہ ان کا ادبی سفر جاری ہے۔

عبید قمر

عبدالکریم (قلمی نام: عبید قمر) ولد غلام احمد مجتبیٰ (آبائی وطن ڈیانواں) پٹنہ میں تعلیمی سند کے اعتبار سے 4/ستمبر 1948 کو پیدا ہوئے۔ پردادا شمس الحق ڈیانوی ایک عظیم المرتبت محدث اور نانا ڈپٹی کلکٹر تھے، یہ زمینداروں کا گھرانہ تھا جس میں زمینداری تو 1947 کے آس پاس ختم ہوگئی مگر علم کی روایت باقی رہی۔ عبید کے بزرگ انھیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر وراثت اور ماحول کے اثرات نے شعروادب کی طرف مائل کردیا اور یہ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد افسانہ نگاری کرنے لگے۔ پہلا افسانہ ''قتل'' 1968 میں ''شاخسار'' (کٹک) میں شائع ہوا۔ اسی سال ایک افسانہ ''فنکار، نئی صدی'' لندن میں بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ اردو میں ''شاعر'' (ممبئی) ہم زبان (ناسک) مریخ (پٹنہ) الفاظ (علی گڑھ) تحریک (دہلی)، ایوان اردو (دہلی) آئندہ اور ارتکاز (کراچی) نیا سفر (الہ آباد) روشنی (امریکہ) اور مباحثہ (پٹنہ) وغیرہ میں ان کی کہانیاں چھپیں۔ ہندی میں ساہتیہ اکادمی سے شائع شدہ سم کالین ساہیتہ کرفیو (کہانیوں کا سنگرہ) اور ''بہار کے اردو کتھا کار'' میں ان کی کہانیاں شائع شدہ ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''آخری

کش' 1981 میں منظر عام پر آیا جس پر ملک کے اہم ناقدین نے اپنی مثبت اور حوصلہ افزا آرا کا اظہار کیا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''ننگی آوازوں کی گونج'' 2008 میں شائع ہوا ہے۔ ''مجرم''، آخری کش''، ''مرغا''، کترن، نامراد گوتم، چمگادڑ اور ''گدائے سر رہگذر'' وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں جن کی ستائش جوگندر پال، احمد یوسف، قمر رئیس، عبدالمغنی اور وہاب اشرفی جیسے مشاہیر ادب نے کی ہے۔ اب تک اردو کے مختلف رسالوں میں ان کے کم وبیش ستر افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض افسانوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

عبید قمر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''رسالہ سہیل'' (گیا) اور پندار (پٹنہ) میں خصوصی گوشے بالترتیب 1983 اور 2004 میں شائع ہو چکے ہیں۔ 1982 میں انھیں نکھار پبلی کیشن مئوناتھ بھنجن (اتر پردیش) کی جانب سے گولڈ میڈل، 1993 میں حکومت بہار کی جانب سے ساہتیہ سمورد ھن سمان اور 2003 میں بہار اردو اکادمی کی جانب سے اعزاز مل چکا ہے۔ علمی مجلس اور ایوان اردو کے زیر اہتمام 1994 میں ایک شام ''عبید قمر کے نام'' کا انعقاد کیا گیا تھا۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے درست لکھا ہے کہ عبید قمر ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو خاموشی سے ادبی کام انجام دیتے رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کی افسانہ نگاری کا پہلا امتیاز عہد حاضر کی ایسی سچائیوں کا بیان ہے جن سے عام طور پہ بعض تحفظات کے سبب ہمارے افسانہ نگار آنکھیں چراتے رہے ہیں۔ 'مجرم'، 'مرغا' اور 'کترن' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ گرچہ ان پر ایک عرصے تک اعتراضات بھی ہوتے رہے ہیں مگر یہی اعتراضات زندہ ادب کی پہچان ہیں۔ ان کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ جدیدیت کے دور عروج میں افسانہ نگاری کرنے اور ایک حد تک اس تحریک سے اثرات قبول کرنے کے باوجود استعاراتی بیان کو حرف آخر نہیں سمجھتے اور ترسیل کے اعتبار سے ان کی کہانیاں قاری کے ساتھ اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھتی ہیں۔ یہ افسانہ نگاری کے فن پر ان کی بھرپور گرفت کا ثبوت ہے۔ اگر وہ اپنی ذاتی پریشانیوں کے حصار سے نکل سکیں تو کچھ اور اچھے افسانے اردو ادب کو مل سکتے ہیں۔ اپنی موجودہ کہانیوں کے حوالے سے عبید قمر ان افسانہ نویسوں کی صف میں رکھے جاسکتے ہیں جو معاشرے کی آلودگیوں کی آئینہ داری تو کرتے ہیں مگر خود اپنے دل ودماغ کو آلودہ نہیں کرتے۔ دراصل ایسے مواقع پر کبھی ان کے کرداروں کی روایت سے غیر وابستگی اور کبھی ذہنی شائستگی ایک مخصوص طرز فکر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ یہاں ایک مثال نقل کرتا ہوں: ''یو آر لکی ڈیر! میں اپنا کنوارا جسم آج شام کی نذر

کرتے ہوئے تمھارے حوالے کرتی ہوں۔ فیصلہ کر کے فلیٹ سے نکلی تھی کہ اس ہوٹل سے نکلتے ہوئے جس مرد پر میری پہلی نظر پڑے گی، مردانہ لذت سے مجھے آشنا کرانے کا شرف بس اسے ہی حاصل ہوگا۔ آؤ ڈیرسٹ پہلے تھوڑی سی گلابی چھلکائیں۔"

"نو تھینک یو! معاف کیجئے گا محترمہ میں رسم شادی کا قائل ہوں"۔ یہ کہہ کر رشید بھائی نے نہایت اطمینان سے اس کی مرمریں باہیں اپنی گردن سے الگ کیں اور اسے گڈ بائی کہتے ہوئے گیٹ سے نکل گئے۔

علی امام

علی امام ولد سید عبدالوحید نالندہ ضلع کے مسیاں گاؤں میں (دیسنہ، بہار شریف سے قریب) تعلیمی سند کے اعتبار سے 20/ دسمبر 1947 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدہ رسول باندی اور منجھلے بھائی کی نگرانی میں گھر ہی پہ ہوئی۔ پھر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیے مدرسہ حبیبیہ دیسنہ، مدرسہ محمدیہ استھانواں، اور ٹاؤن ہائی اسکول بہار شریف کے طالب علم رہے۔ بالآخر راشٹریہ ہائی اسکول داؤدنگر سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج آف کامرس پٹنہ سے بی-ایس-سی کیا اور یہاں بزم اردو کے سکریٹری بھی رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (سماجیات) کا امتحان پاس کرنے کے بعد مگدھ یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کیا۔ اس دوران ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھونیشور سے بی-ایڈ اور ہماچل یونیورسٹی شملہ سے ایم-ایڈ کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

ابتدا میں انسان اسکول کشن گنج میں سائنس کے ٹیچر ہوئے اور 1983 سے بہار-ایس-آر-سی برائے تعلیم بالغاں (دیپایتن) میں معاون ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ پرنسپل ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ رہے اور فی الحال تعلیم و تربیت اور تحقیق سے متعلق کئی اداروں میں فری لانس کنسلٹنٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ حکومت ہند نے

NCTE بھوپیشور کا ممبر بھی بنایا ہے۔ سجادہ نشیں خانقاہ منیر شریف سید شاہ نورالدین احمد (مرحوم) کی صاحبزادی سعدیہ فردوسی سے شادی ہوئی جس سے دو بیٹیاں سارہ اور سعدیہ نیز ایک بیٹا یاسر علی وحید ہے۔ علم وادب سے رغبت انھیں وراثت میں ملی ہے۔ ان کے ایک بھائی ڈاکٹر سید نثار مصطفےٰ سابق صدر شعبۂ اردو کوآپریٹو کالج جمشید پور ادبی دنیا میں خاصے معروف رہے ہیں۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے علی امام کی خدمات دو پہلوؤں سے عبارت ہیں۔ ایک تو وہ افسانہ نگار ہیں اور 1970 کے آس پاس ابھرنے والے اہم افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے وہ مسلم بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت اور تعلیم بالغاں کے سلسلے میں بے حد فعال رہے ہیں۔ اور خاص طور پہ اردو داں طبقے میں تعلیم بالغاں کے فروغ کے لیے ان کی تیار کردہ تدریسی کتابیں اور رپورٹیں خاصی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ''پرانے کمرے میں تنہا آدمی'' کہانیوں کی انتھولوجی 'صدا آہنگ'' (مطبوعہ پٹنہ) 1968 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مختلف رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا جو جدیدیت سے متاثر تو تھے مگر اس کے اکثر موضوعات کو اپنے انفرادی تخلیقی رویے کے ساتھ برتنے پر قادر تھے۔ علی امام اب بھی مقبول کہانیاں لکھ رہے ہیں اور ساتھ ہی تعلیم وتدریس، سماجیات اور قومی مسائل سے متعلق ان کے مضامین بھی اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ اب تک ان کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور مختلف نصابی یا تدریسی کتابوں میں وہ Co-Writer رہے ہیں۔

1۔ نہیں (افسانوی مجموعہ) 1985. 2۔ مت بھید (افسانوی مجموعہ) 3.1995۔ تعلیم بالغاں اور دیہی ترقی: آدی باسیوں کے تناظر میں (مطبوعہ دہلی۔ کامن ویلتھ پبلشرز، انگریزی) 4۔ مسلم بچیوں میں تعلیم و ناخواندگی — بہار کے تناظر میں (مطبوعہ نومبر 2010۔ بہ زبان ہندی) 1971 میں آہنگ، گیا (مدیر کلام حیدری) کے شمارہ 14 میں ان کا ایک خصوصی مطالعہ شریکِ اشاعت ہے۔ روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ 29/اپریل 2013 کے ادبی اڈیشن میں ان پر ایک خصوصی گوشہ شائع ہوا ہے جس میں آدھ درجن سے زیادہ مشاہیر اردو کی آرا شامل ہیں۔

عالم خورشید

محمد خورشید عالم خاں (قلمی نام: عالم خورشید) ابن عبدالرشید خاں تعلیمی سند کے مطابق 11 رجولائی 1959 کو آرہ (ضلع بھوجپور) میں پیدا ہوئے۔ اصل تاریخ پیدائش 30 رمئی 1956 ہے۔ میٹرک تا گریجویشن کی تعلیم آرہ میں حاصل کی۔ کاشی مہادو یالیہ سے ایم۔اے (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ملازمت کا آغاز ایک بینک کی نوکری سے کیا تھا مگر فی الحال حکومت ہند کی ملازمت کرتے ہوئے پٹنہ میں سینیر اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

خورشید کا خاندانی اور آبائی پس منظر علمی وادبی نہیں ہے۔ والد پولیس کی نوکری میں تھے۔ آبائی پیشہ سپہ گری اور زراعت تھا۔ بھوجپوری زبان کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ اسکول میں ہندی اور سنسکرت کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور کالج میں کامرس کے طالب علم رہے۔ ایسے میں اردو زبان وادب سے ان کی دلچسپی کا سبب ان کے اپنے مطالعے اور اس زبان کی دلکشی کے سوا کچھ نہیں۔ پٹنہ میں قیام کے دوران مختلف علمی وادبی شخصیتوں سے قربت، ادبی پروگراموں میں شرکت اور ملک کے مختلف شہروں کے سفر نے ان کے ذوق ادب کو جلا بخشی ہے۔ ای۔ٹی۔وی اردو کے زیر اہتمام

جو ٹیلنٹ سرچ پروگرام چلایا گیا تھا اس کے سلیکوس میں ایک ماہر فن کے طور پہ عالم خورشید بھی تھے۔ آل انڈیا ریڈیو اور ٹی۔ وی سے ان کا کلام برابر نشر ہوتا ہے۔

خورشید کی شعر گوئی کا آغاز 1978 کے آس پاس ہوا۔ ابتدائی کلام شب خون الہ آباد (1979) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف رسالوں میں ان کی غزلیں منظر عام پہ آتی رہیں۔ اردو میں ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہندی میں بھی ایک مجموعہ شائع ہوا۔ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(1) نئے موسم کی تلاش (غزلیں اور نظمیں) 1988، (2) زہر گل (غزلیں) 1998، (3) خیال آباد (غزلیں) 2003، (4) کارزیاں (2008)، (5) ایک دریا خواب میں (ہندی) 2005۔

انھیں ''نئے موسم کی تلاش'' پر بہار اردو اکادمی سے انعام ملا ہے۔ ''زہر گل'' کے لیے بہار اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے انعام دیا ہے، ساتھ ہی ''جوش ملیح آبادی ایوارڈ'' بھی ملا ہے۔ عالم خورشید نثر نگار بھی ہیں اور ان کے بعض اچھے مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ گرچہ اس حیثیت سے وہ زیادہ معروف نہیں ہیں۔

عالم خورشید جدید ''لب و لہجے اور نئی فکر کے شاعر ہیں۔ زیادہ تر غزلیں لکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف اکثر ناقدین نے کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی ان کے شعری رویے کی انفرادیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ان کی فکر میں جدیدیت اور اس کے پہلے کی صورتوں کا ادغام ہے جو اپنی انفرادیت یوں قائم کرتی ہے کہ بے حد پیچیدہ اور الجھے ہوئے معاملات سہل انداز میں شعر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس لیے روایتی اسلوب اپنے خد و خال بدل لیتا ہے اور لفظوں کے جدلیاتی استعمال سے نئی معنوی سطح ابھر جاتی ہے۔ غالباً عالم خورشید کا یہی رویہ انھیں مقبول بھی بناتا ہے اور ان کے بظاہر سہل اشعار کی معنوی جہتوں کی تلاش پر کمر بستہ بھی کرتا ہے۔''

نمونہ کلام کے طور پہ ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں

ہوا ہے میرے لیے اہتمام پھر شاید بنا گیا ہے نیا کوئی دام پھر شاید

الٹ رہے ہیں سبھی خیروشر کے پیمانے
بدل رہا ہے ہمارا نظام پھر شاید

کوئی چراغ نہیں جلتا میری بستی میں
ہوائیں ہونے لگیں تیزگام پھر شاید

الجھ رہے ہیں یہاں سائے اپنے پیکر سے
کسی بلانے کیا ہے قیام پھر شاید

کسی نے آگ لگائی ہے پھر مرے گھر میں
اچھالا جائے گا میرا ہی نام پھر شاید

خفا ہیں اپنے مکینوں سے اب مکاں عالم
پناہ مانگتے ہیں صحن و بام پھر شاید

چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں

شکم کی آگ سے بڑھ کر کوئی وبال ہے کیا
ہمیں خبر ہی نہیں ہجر کیا وصال ہے کیا

پھر آسمان ملنے لگا ہے زمین سے
پھر گل کھلائے گی یہ ملاقات کچھ نہ کچھ

ٹھٹھرتے موسموں میں یوں گزارا کرتے رہتے ہیں
لہو کا ایک اک قطرہ شرارہ کرتے رہتے ہیں

عطا عابدی

محمد عطا حسین انصاری ولد محمد عابد حسین انصاری تعلیمی سند کے لحاظ سے یکم نومبر 1962 کو برہولیا (دربھنگہ) میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایم -اے (اردو) اور پی-ایچ-ڈی-کیا۔ شاعری کا آغاز 83-1982 کے آس پاس ہوا۔ ابتدا سے ہی ذہن کا سانچہ مذہبی تھا جس کے اثرات زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری پہ بھی پڑے۔ انھوں نے ابتدا حمد ونعت سے کی اور بعد میں بھی ان اصناف سخن سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ ساتھ ہی غزل گوئی سے بھی ناطہ جوڑا اور کلاسیکی شاعری سے وابستگی کے باوجود لفظوں کے ساتھ نئے تخلیقی برتاؤ کی ایک شعوری کوشش کی۔ 1997 سے وہ مسلسل پٹنہ میں ہیں، بہار ودھان پریشد میں ملازمت کرتے ہیں اور اپنی دفتری ذمہ داریوں سے وقت نکال کر اردو شعر وادب کی خدمت میں بھی مصروف ہیں۔ یہ زبان وادب سے ان کی ذہنی وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے تنقیدی تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں اور بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا ہے۔

عطا عابدی کا سرسری مطالعہ بھی یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہے کہ ان کی خدمات کسی ایک ادبی پہلو کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ اپنی عقیدت مندانہ شاعری سے متعلق ان کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے شعروسخن کے ذریعہ خدااور رسول کی تعریف نہیں کی
بلکہ خدااور رسول کی تعریف کر کے اپنے شعروسخن کو قابلِ تعریف بنالیا ہے۔''

(ماخوذ از افکار عقیدت)

اسے فضل ربی سمجھیے یا ان کی پرخلوص کاوش کا نتیجہ لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے حمد و نعت کے حوالے سے اپنی ایک شناخت قائم کی ہے اور بجا طور پر اہم تنقید نگاروں نے اس باب میں ان کی انفرادی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''عطا عابدی کی یہ تخلیقی شق عام طور پر لائق تحسین سمجھی جارہی ہے اور اسی لیے میں ان
کی شخصیت کے اس پہلو کو ان کی صلاحیت کا آئینہ سمجھتا ہوں۔''

(انتخاب شمارہ 23)

جہاں تک صنف غزل کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس باب میں انھوں نے اپنی کوئی راہ متعین نہیں کی ہے۔ وہ کہتے تو ہیں کہ:

ہوں دور نو کا میں بھی ایک حصہ
مگر اگلی شرافت چاہتا ہوں

اور یہ بھی کہ غزل میں جان اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی سلگتی ہوئی ریت پر چلنے کا ہنر حاصل کر لے۔ مگر اس ہنر کا حصول آسان نہیں۔ ان کے یہاں سادگی دلنوازی، سوز و ساز و درد و داغ و آرزو اور انسانی دردمندی کے بہت سارے رنگ ملتے ہیں مگر اب تک کوئی رنگ اگر تھوڑا بہت نمایاں ہے تو وہ حوصلہ مندی کا رنگ ہے۔ ممکن ہے یہی آئندہ ان کی غزل گوئی کی اساس بن جائے۔

عطا عابدی کی اب تک درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

1۔ آئینہ عقیدت (حمد و نعت کا مجموعہ) 1987
2۔ عکسِ اشک (ترتیب۔ رثائی شاعری کا مجموعہ) 1987
3۔ فصل آگہی (ترتیب۔ سلیم انصاری کا مجموعہ) 1996
4۔ تشکیل و تعبیر (ناوک حمزہ پوری کے مضامین کا مجموعہ) 2001
5۔ بیاض (شعری مجموعہ) 2003
6۔ مطالعہ سے آگے (تنقیدی و تحقیقی مضامین) 2006

7۔ افکارِ عقیدت (حمد و نعت کا مجموعہ) 2007

8۔ نوشتِ نوا (شعری مجموعہ) 2009

9۔ زندگی، زندگی اور زندگی (شعری مجموعہ) 2010

10۔ خوشبو اپنی (بچوں کے لیے نظمیں) 2012

11۔ مناظرے مذکر و مونث کے (بچوں کے لیے کہانیاں) 2012

فخرالدین عارفی

محمد فخرالدین (قلمی نام: فخرالدین عارفی) ولد سید محمد اظہار الحسن تعلیمی سند کے مطابق 29 رجنوری 1954 کو پٹنہ کے محلہ محمد پور شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد مشہور قصبہ کرائے پرسرائے (موجودہ ضلع نالندہ) سے دو میل دکھن ایک چھوٹے سے گاؤں جلال پور کے رہنے والے تھے۔ نانا سید محمد ابراہیم تقسیم ہند سے قبل صغریٰ وقف اسٹیٹ کے متولی تھے۔ 47-1946 کے فسادات میں ان کے والد کو چھوڑ کر خاندان کے باقی تمام افراد شہید کر دیے گئے۔ ان کے والد جو ایک اوسط درجے کے زمیندار اور پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے صرف اس لیے زندہ بچ گئے کہ وہ ان دنوں ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں پٹنہ ہائی کورٹ آئے ہوئے تھے۔ بہر حال تقسیم وطن کے بعد انھوں نے 1950 سے شاہ گنج میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور 1952 میں اپنے دوستوں کے اصرار پہ دوسری شادی کی جس سے تنہا اولاد فخرالدین ہیں۔ ان کی باضابطہ تعلیم مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں 1961 سے شروع ہوئی۔ 1974 میں عالم اور 1976 میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دوسری طرف پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے 1971 میں میٹرک پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں پروفیسر محمد علی خاں اور ڈاکٹر شکیب ایاز کی نگرانی میں اردو آنرس کی پڑھائی مکمل

کی۔ 1988 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ایم۔اے اور 1981 میں ڈپ۔ان۔ایڈ کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔اسی دوران 1979 میں انھیں فارسی زبان کے استاد کی حیثیت سے سرکاری ملازمت مل گئی۔اب تک اسی ملازمت سے وابستہ ہیں۔اپریل 1976 میں سید وسیع الرحمٰن (عزیز منزل، چٹکمہ بازار) کی صاحبزادی مسرت یاسمین سے شادی ہوئی جن سے ماشا اللہ پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔تادم تحریر دو بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور اردو ادب وصحافت سے عملی دلچسپی رکھتی ہیں۔

فخرالدین عارفی کی ادبی زندگی کا آغاز 1989 میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سلگتے خیموں کا شہر'' 1984 میں شائع ہوکر خاصا مقبول ہوا۔اب تک تقریباً ایک سو افسانے ،ریڈیائی فیچرز اور مضامین وغیرہ تحریر کر چکے ہیں۔ان کا ایک ریڈیائی فیچر سہیل عظیم آبادی جو ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوا، بے حد پسند کیا گیا تھا۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بہار اردو اکادمی کے علاوہ اردو قبیلہ جمشید پور کی جانب سے منظر کاظمی ایوارڈ ،اردو مرکز بہار کی جانب سے شفیع تمنائی ایوارڈ اور بزم فروغ ادب کی جانب سے ڈاکٹر عبدالمغنی ایوارڈ مل چکا ہے۔شعبہ تعلیم میں نمایاں کارکردگی کے لیے بہار لوک جیون پٹنہ سے ڈاکٹر رادھا کرشنن ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

فخرالدین عارفی کی ادبی خدمات کا ایک اہم پہلو بہار کی اردو تحریک میں فعال شمولیت سے عبارت ہے۔انھوں نے الحاج غلام سرور اور ڈاکٹر عبدالمغنی کے ساتھ بہار کی اردو تحریک میں مسلسل کام کیا ہے۔ 1971 سے تاحال وہ انجمن ترقی اردو (بہار) کے ادبی ترجمان ''مریخ'' کی ادارت اور دوسری ادبی سرگرمیوں سے جڑے رہے ہیں اور سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کی حیثیت سے بھی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ایک عرصے تک انھیں بہار اردو اکادمی اور اردو مشاورتی کمیٹی محکمہ راج بھاشا حکومت بہار میں رکن مجلس عاملہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔

فخرالدین عارفی نے افسانہ نگاری کا آغاز 'جدیدیت' کے دور عروج میں کیا تھا اور وہ ایک عرصے تک علامتی اور تجریدی افسانے لکھتے رہے گرچہ اس دور میں بھی عارفی کے یہاں ایک نوع کی فکری وفنی صلابت اور شائستگی موجود رہی۔مگر اپنے پہلے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے چند ہی برسوں بعد وہ فکری وفنی سطح پر جدیدیت سے دور ہوتے گئے اور بیانیہ سے ان کی وابستگی بڑھتی گئی۔حال کے برسوں میں انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں زبان وبیان کی دلکشی کے ساتھ روزمرہ کے مسائل وحالات کی پیش کش نے ان کی افسانہ نگاری کو ایک نیا موڑ عطا کیا ہے۔ان کے بدلتے ہوئے اسلوب

کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''یادیں تو چاند ہوتی ہیں، جو گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں لیکن فنا نہیں ہوتیں''۔ یہ بات ایک دن گفتگو کے دوران مجھ سے شہناز نے کہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی خوب صورت اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی باتیں کیا کرتی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پیار کی مٹھاس میں ڈوبا ہوا اور اپنائیت کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی جھیل جیسی آنکھیں اتنی خوب صورت اور پیاری تھیں کہ ہر دیکھنے والے کے دل میں طوفان پیدا کر دیتی تھیں۔''

قتیل داناپوری

سید شاہ محمد قائم رضوی (تخلص قتیل اور آبائی شہر کی مناسبت سے قلمی نام قتیل داناپوری) ولد سید شاہ محمد حسین قادری مستند شہادتوں کے اعتبار سے 28/جمادی الاول 1311ھ بمطابق 1893) اپنے آبائی شہر داناپور (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مسجد جامع مسجد داناپور اور مدرسہ حشمت داد خاں (داناپور) میں حاصل کی۔ بلدیہ ہائی اسکول داناپور سے ہائی اسکول اور 1912 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ این کالج، پٹنہ میں داخلہ لیا مگر مختلف وجوہات کے سبب تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ البتہ کلکتہ یونیورسٹی سے آزادانہ طور پر ہومیوپیتھی کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

قتیل کی پہلی شادی مئی 1913 میں حکیم حسن علی مرحوم (آرا) کی نواسی سے ہوئی۔ تقریباً چھ سال کی رفاقت کے بعد اہلیہ کا انتقال ہوگیا تو دوسری شادی جمواداں، پیر بگہہ کے میر حفاظت حسین کی صاحبزادی سے کی مگر وہ بھی چار سال کے بعد داغ مفارقت دے گئیں اور ان شادیوں سے جو اولادیں ہوئی تھیں وہ بھی کم سنی میں ہی فوت ہوئیں تو پھلواری شریف کے خانوادۂ شاہ مجیب اللہ قادری میں تیسری شادی کی۔ اہلیہ کا نام محمودہ خاتون تھا جو خود بھی شاعرہ تھیں۔ ان کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بطن سے جو اولادیں ہوئیں ان میں سے دو لڑکے سید شاہ طلحہ رضوی برق اور سید نظام الدین نیز

دو صاحبزادیاں بقید حیات ہیں۔ ان امور کی تفصیل ڈاکٹر محمد صدر عالم صدیقی کی کتاب ''بیسویں صدی کے چند شعرائے داناپور'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ قتیل داناپوری نے کئی بار حج کی سعادت کی۔ 1962 میں آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ داناپور کے سجادہ نشیں ہوئے اور طویل عمر پاکر 17 رجولائی 1985 کو جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

قتیل کی ادبی زندگی کا آغاز 1914 کے آس پاس آرہ کی شعری نشستوں میں شرکت سے ہوا۔ 1916 میں بدر آروی کی شاگردی اختیار کی مگر چند غزلوں کی اصلاح کے بعد ہی استاد کے مشورے کے مطابق آزادانہ مشق سخن کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ کم وبیش ستر سال تک شعروادب کی آبیاری میں مصروف رہے۔ اردو اور فارسی میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی، نثر میں مضامین لکھے اور انگریزوں کی درس و تدریس کے دوران اسلامی نظریات کے دفاع اور ان کے غلط قسم کے مسیحی نظریات کی تردید میں انگریزی کتابچے تحریر کیے۔ عروض پر بھی کچھ کام کیا مگر خاص توجہ عقیدت مندانہ کلام پر رہی۔ ان کی غزلیں اگر کلاسیکی طرز سخن اور ایک مخصوص اخلاقی نظام کا آئینہ ہیں تو نعتیہ نظمیں خالص پوربی لب و لہجے اور والہانہ انداز بیان کا نمونہ۔ زبان و بیان کا یہ پیٹرن ایک زمانے میں بے حد مقبول ہوا تھا

ہم بھکاری، آپ داتا بھیک دیجیے یا نبیؐ
ہے اسی در کا سہارا بھیک دیجیے یا نبیؐ

باپ دادا سب اسی ڈیوڑھی سے جیتے آئے ہیں
میرے ان اگلوں کا صدقہ بھیک دیجیے یا نبیؐ

مظہر حق، نور پیکر، زینت عرش عظیم
صاحب قوسین و ادنیٰ بھیک دیجیے یا نبیؐ

کل مسلمانانِ داناپور کو لایا ہوں ساتھ
اک نظر ان سب پہ شاہا، بھیک دیجیے یا نبیؐ

ہے بھکاری خاندانی یہ قتیل بے نوا
بھیک لینے کو ہے آیا، بھیک دیجئے یا نبیؐ

غزل کے دو اشعار نقل کرتا ہوں ؎

تمام عمر میں گونگے کا خواب بن کے رہا
کسی کو ہو نہ سکی میری داستاں معلوم

فروتنی ہے کمال انسان اسی میں ثمرہ ہے زندگی کا
جو شاخ جھک کر زمیں پر آئے یقیں ہے وہ بارور بھی ہوگی

قتیل داناپوری سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی پروفیسر صلاح الدین حیدر

نے مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا کے لیے لکھا تھا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کا بیان ہے کہ قتیل صاحب کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے مگر انھوں نے کوئی فہرست پیش نہیں کی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''تجلیات قتیل (مطبوعہ 1965) کے آخر میں پینتیس تصنیفات وتالیفات کی فہرست ہے جن میں سے دو تشنہ طباعت ہیں۔ سات مطبوعہ انگریزی کتابوں کا بھی نام اس فہرست میں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے ان میں سے بیشتر کتابچے ہیں جو مسیحی نظریات کی تردید یا اسلامی نظریات کے دفاع میں لکھے گئے ہیں۔ ''دبستان عظیم آباد'' میں بھی ان کی چھبیس کتابوں کی فہرست ملتی ہے اور چند انگریزی کتابوں کی اشاعت کا تذکرہ۔ میری نظر میں ان کی قابلِ ذکر تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔ تجلیات قتیل (اردو دیوان) مطبوعہ 1965
2۔ ساغر کیف (فارسی دیوان) مطبوعہ 1952
3۔ خورشید سحر (فارسی دیوان) مطبوعہ 1968
4۔ رباعیات خاص (223 رباعیوں کا مجموعہ) مطبوعہ 1955
5۔ ضیاالعروض (تحریر کردہ 1918) مطبوعہ 1986
6۔ Mohammad in Divine Books
7۔ افکارالابرار
8۔ انتسابِ الاخیار
9۔ خزینۂ الانوار
10۔ Qateel's Urdu Prosody in English (غیر مطبوعہ)

اردو کے اہم ناقدین اور محققین نے شاہ قتیل داناپوری کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور بحیثیت مجموعی وہ نہ صرف اپنے عہد کی ایک مقبول اور قابلِ احترام ادبی شخصیت رہے ہیں بلکہ انھوں نے داناپور اور اس کے مضافات میں اردو شعر وادب کی ترقی کے لیے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان کی قادرالکلامی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر کتابوں کے نام سے ان کا سالِ اشاعت برآمد ہوتا ہے۔

قیوم خضر

شیخ عبدالقیوم (قلمی نام: قیوم خضر) ولد شاہ اختر حسین تعلیمی سند کے مطابق 8/دسمبر 1924 کو پیدا ہوئے۔ محلہ موریہ گھاٹ گیا، ان کی جائے پیدائش ہے۔ ان کی تصنیف ''ارتعاش قلم'' کی رسم اجرا کے موقع پر ادبی مرکز، پٹنہ کی جانب سے ''قیوم خضر - ایک تعارف'' کے نام سے ایک مختصر سا کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں ان کے حالات زندگی تفصیل سے درج ہیں۔ سلطان آزاد کی کتاب 'دبستان عظیم آباد' میں بھی ان کا ذکر موجود ہے مگر سال پیدائش غلط درج ہو گیا ہے۔

قیوم خضر نے ابتدائی تعلیم گھر پہ ہی مولانا اسمٰعیل مانپوری سے حاصل کی۔ قاعدہ بغدادی کے بعد اردو اور فارسی کی مروجہ درسی کتابوں کے علاوہ قرآن پاک اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ کچھ دنوں کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا مگر ابتدائے عمر سے ہی کانگریس اور جنگ آزادی کی تحریک سے وابستگی کے سبب واپس گیا آنا پڑا۔ ضلع اسکول گیا سے 1945 میں میٹرک پاس کیا، مگر تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا چونکہ سیاسی سرگرمیوں کے سبب مسلم لیگ کے کارکنوں اور حکومت دونوں ہی کا دباؤ جھیلنا پڑا۔ بالآخر 1953 میں گیا سے پٹنہ چلے آئے اور تا عمر یہیں مقیم رہے۔ 1944 میں شادی ہوئی تھی۔ دو بیٹے

نشاط خضر اور اظہار خضر علم وادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ابتدا میں موصوف محلہ صادق پور، پٹنہ سیٹی میں رہتے تھے۔ بعد میں پٹنہ سیٹی کورٹ کے نزدیک ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے۔ 12/مارچ 1998 کو یہیں انتقال ہوا اور شاہی عیدگاہ، گلزار باغ، پٹنہ سیٹی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

قیوم خضر کی ادبی زندگی کا آغاز 1943 کے آس پاس شاعری سے ہوا۔ ابتدا میں انھوں نے علامہ سریر کابری سے اصلاح لی، پھر آزادانہ مشق سخن کرنے لگے۔ مگر وہ شاعری تک محدود نہیں رہے۔ ویسے بھی وہ ایک سیماب صفت شخصیت کے مالک تھے۔ عملی سیاست سے وابستگی نے انھیں مزید فعال بنا دیا۔ نتیجے کے طور پر انھوں نے بیک وقت سیاست، شاعری، نثر نگاری اور ادبی صحافت کے میدانوں میں طبع آزمائی کی۔ اگست 1950 میں اشارہ (ماہنامہ) نکالا جو وقفے وقفے سے 1975 تک شائع ہوتا رہا۔ کئی اخبارات و رسائل میں مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ ادبی، لسانی اور سماجی موضوعات پر مقالے لکھے، تصوف اور تاریخ سے بھی دلچسپی رہی، اور مشق سخن بھی جاری رہی۔ ساتھ ہی سیاسی زندگی کے پیچ و خم سے بھی گزرتے رہے مگر اپنے عہد کی اہم سیاسی شخصیتوں سے قربت کے باوجود انھیں کبھی کوئی اعلیٰ عہدہ نہ حاصل ہو سکا۔ وہاب اشرفی نے درست لکھا ہے کہ اپنی شرطوں پر زندگی گذارنے کی وجہ سے سیاست نے انھیں کبھی سنبھالا نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قیوم خضر اپنے آزادانہ مطالعے کی وسعت اور زبان و بیان پہ قدرت کے سبب اردو زبان و ادب کی جو خدمت کر سکتے تھے وہ نہیں کر سکے چونکہ سیاسی مصروفیات پر بھی ان کے شب و روز خرچ ہوتے رہے۔ اس کے باوجود انھوں نے لسانیات، تصوف اور مسلمانوں کے سماجی مسائل سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو کے ناقدوں اور دانشوروں نے ان کی سیاسی شخصیت کے سبب ادبی کاوشوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ ان کے اٹھائے گئے بعض سوالات اور نکات آج بھی معنویت کے حامل ہیں۔ بہر حال، ان کی مختلف کتابوں پر اردو اکادمیوں سے انعامات ملتے رہے اور مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں بہار اردو اکادمی نے 1983 میں اور بہار سرکار نے 1993 میں انھیں ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

اردو در پن (لسانیات) 1968، مسلمان اور حالات حاضرہ (سیاسیات) 1971
اردو میں قومی یکجہتی (لسانیات) 1975،
صادق پور: قربان گاہ آزادی وطن (تاریخ) 1979، خضر راہ (تصوف) 1982

تنویرات (مختلف النوع مضامین کا مجموعہ) 1989

کلید گم گشتہ کی بازیافت (سماجیات) 1995، تشنگی (مجموعۂ کلام) 1999

ارتعاش قلم (ادبی مضامین کا مجموعہ) 2000، محاسبہ (خودنوشت) 2002

ان کے علاوہ درج ذیل کتابوں کے زیر ترتیب ہونے کی اطلاع ''ارتعاش قلم'' میں موجود ہے:

مگہی زبان وادب (لسانیات وادبیات)

نشتر نوک قلم (''اشارہ'' کے اداریوں کا مجموعہ)

سرگوشیاں (مجموعہ خطوط)

آہٹیں (مجموعۂ خطوط)

ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی کردار (سیاسیات)

قاسم خورشید

تاریخی نام سید محمد قاسم خورشید اور گھریلو نام جعفر ہے۔ والد کا نام سید غلام ربانی عرف خورشید سبحانی اور دادا کا سید غلام محمد عمر ہے۔ تعلیمی سند کے اعتبار سے 2 رجولائی 1960 کو کاکو ضلع جہان آباد (بہار) میں پیدا ہوئے۔ 1975 میں میٹرک پاس کیا۔ اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی سے آئی۔ اے پٹنہ کالج سے بی۔ اے آنرز اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو (1983) اور پی ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد ٹیلی ویژن پروگرام پروڈکشن، تکنیکی آپریشن ،اسکرپٹنگ کورس وغیرہ کی تربیت اے۔ آے۔ آئی۔ ڈی (ملیشیا سی۔ آئی۔ ای۔ ٹی) ISRO احمد آباد اور سی۔ آئی۔ ای۔ ٹی۔ نئی دہلی سے حاصل کی۔ ابتدا میں آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں عارضی اناؤنسر کی حیثیت سے ملازمت ملی۔ وہیں شاہدہ وارثی سے ملاقات ہوئی اور 1988 میں انھیں شریک حیات بنالیا۔ جلد ہی باضابطہ سرکاری ملازمت مل گئی جہاں ترقی کرتے ہوئے فی الحال صدر ڈیپارٹمنٹ آف لینگویجز اس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی حکومت بہار کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اردو کی معیاری درسی کتابوں کی ترتیب کے نگراں ہیں۔

قاسم خورشید کا تعلق سادات کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا مگر یہ زمینداری ان کے دادا کے وقت میں ہی ختم ہوگئی۔ سفید پوشی پھر بھی قائم تھی مگر والد کی اچانک وفات نے سارا نظام زندگی درہم

برہم کر دیا اور جب ان کی ماں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اپنے مائیکے چلی گئیں تو صرف سات سال کی عمر میں انھیں اپنے خالہ زاد ماموں مظفر الجاوید کے یہاں پٹنہ منتقل ہونا پڑا۔ یہاں ایک طویل جدوجہد سے بھری زندگی ان کے حصے میں آئی۔ انھوں نے اسکول کی طالب علمی کے دوران ہی ٹیوشن پڑھائے، موٹر ورک شاپ میں کام کیا اور کئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ماں کی دعاؤں اور ماموں کی حوصلہ افزائی نے انھیں زندگی کی ہر دشواری میں سہارا دیا جس کا اعتراف وہ برملا کرتے رہے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک زندگی کی سنگین سچائیاں جس طرح ان کے روبہ رو رہیں اور سماجی نابرابری کے سبب موجِ بلا جس طرح ان کے سر سے گذرتی رہی، اس کا اثر ان کی ابتدائی تحریروں پہ نمایاں ہے۔

قاسم خورشید کے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا جب ہندی کے مشہور رسالہ ''پرگتی شیل سماج'' میں ان کی دو غزلیں شائع ہوئیں۔ پہلی کہانی ''روک دو'' 1979 میں 'زبان وادب' پٹنہ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ملک کے مختلف رسالوں میں کہانیاں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور مشاعروں کے علاوہ ریڈیو یا ٹی۔ وی کے وسیلے سے ان کا کلام بھی سامنے آتا رہا۔ انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کی طرف بھی توجہ دی اور ان کی کہانیاں اور غزلیں معیاری رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کا ایک اور پہلو اردو اور ہندی ڈراموں کی تخلیق اور پیش کش سے عبارت ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے بعض مشہور افسانوں کو ڈراموں کی شکل میں اسٹیج سے پیش کیا۔ ساتھ ہی ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے فیچرز بھی لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ پٹنہ میں جب ایجوکیشنل ٹی۔ وی کی شروعات ہوئی تو قاسم خورشید کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ انھوں نے پہلی ٹیلی فلم ''پیڑ ہمارے ساتھی'' بنائی جو دہلی دوردرشن سے نشر ہوئی۔ اس کے بعد کم از کم پانچ سو فلمیں انھوں نے تیار کیں جن کو ملک اور بیرون ملک کے فلم فیسٹول میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے انھیں جاپان فلم فیسٹول اور نیشنل فلم فیسٹول میں انعامات مل چکے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کافی فیچر فلمیں تیار کی ہیں۔ گذشتہ کچھ دنوں سے وہ ادبی شخصیات اور موضوعات پہ مضامین بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

پوسٹر (اردو کہانیاں) مطبوعہ 1994، ریت پر ٹھہری ہوئی شام (افسانوی مجموعہ 2010)، کینوس پر چہرے (افسانوی مجموعہ 2010)، تھکن بولتی ہے (شاعری بہ زبان ہندی)، دل تو ہے

بنجارا (شعری مجموعہ)، بہار قانون ساز کاؤنسل میں اقلیت (سیاسی تجزیہ)، سنولائی دھوپ (کیف کی غزلوں کی ترتیب)، ٹوٹے ہوئے چہرے (مزاحیہ شاعری تالیف)

درج ذیل کتابوں کی زیر اشاعت ہونے کی اطلاع مختلف ذرائع سے ملتی رہی ہے:

1۔ اندر آگ ہے (کہانیوں کا مجموعہ)

2۔ وہ لڑکی (اردو کہانیوں کا مجموعہ)

3۔ چوہے (ڈراموں کا مجموعہ)

4۔ ایک اور ہندوستان (ڈراموں کا مجموعہ)

5۔ گئو دان کی تنقید (مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی)

ان کی بہت ساری تخلیقات ملک کے مختلف رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔

محمد حسن، قمر رئیس، وہاب اشرفی، ندا فاضلی، انتظار حسین، احمد یوسف، شہریار، جابر حسین اور افتخار امام صدیقی جیسے مشاہیر اور دانشوروں نے قاسم خورشید کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ انور سدید نے ان کے افسانے 'کئی کارا جگمار' کے حوالے سے انھیں عہد نو کا منفرد افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ ان کی مطبوعہ کہانیوں میں ''پوسٹر'' کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ قاسم خورشید کا تخلیقی سفر جاری ہے اور ان سے ابھی بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔

کلیم الرحمٰن کاکوی

کلیم الرحمٰن ولد عطا الرحمٰن عطا کاکوی تعلیمی سند کے اعتبار سے 5/جولائی 1949 کو پیدا ہوئے۔ مسلم ہائی اسکول پٹنہ سے میٹرک اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (نفسیات) کا امتحان پاس کیا۔ مگدھ یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی (نفسیات) کی سند حاصل کرنے کے بعد اسی انسٹی ٹیوٹ کے ایک اقلیتی ادارے اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آبائی وطن کاکو، ضلع جہان آباد ہے اور اسی نسبت سے آپ کا ایک ادبی پس منظر بھی ہے۔ دادا غفور الرحمٰن حمد کاکوی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ولی الرحمٰن ولی کاکوی اور منظور الرحمٰن اختر کاکوی کا اپنے زمانے میں نامور ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ بھائی ارشد کاکوی مرحوم 'خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود' کے مصداق کم دنوں زندہ رہے مگر ادبی دنیا میں اپنا ایک نقش چھوڑ گئے۔ چچازاد بھائیوں محمود پرویز اور نعیم صبا کی بھی ادب سے گہری وابستگی رہی۔ ایسے میں کلیم الرحمٰن کے ادبی ذوق کی نمو ایک فطری امر تھی۔ اس کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے خاصی تاخیر سے لکھنا شروع کیا۔ بہر حال، گذشتہ دس برسوں سے ان کے خاکے، انشائیے، خاکے، اور ادبی ونفسیاتی پہلوؤں سے متعلق مضامین تواتر کے ساتھ منظر عام پر آرہے ہیں۔ انھوں نے جو طرز

خاص اپنے لیے منتخب کیا ہے اس میں بظاہر صرف شوخی، روانی اور بے تکلفی ہے مگر اس اسلوب کی تہہ میں اترے تو معنی کے کتنے ہی دریچے کھل جاتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ وہ بکھراؤ سے محفوظ رہے تو اپنی ایک پہچان بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ فی الحال ان کی درج ذیل تصنیفات کے زیر طبع ہونے کی اطلاع ہے:

سنجیدہ آوارگی (خاکے)
انتشاریہ (انشائیے)
بات نکلے گی تو (طنز و مزاح پر مبنی مضامین)

بیتاب عظیم آبادی

سید علی خاں ولد عبدالکریم خاں تسلیم محلہ مغلپورہ پٹنہ سیٹی میں 1866 میں پیدا ہوئے ستمبر 1928 میں انتقال کیا اور یہیں کشمیری باغ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ عرف عام میں لاڈلے صاحب مختار اور ادبی دنیا میں بیتاب عظیم آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ ''گلشن حیات'' میں سال پیدائش 1865 درج ہے۔

شاد عظیم آبادی کے شاگردوں کی تعداد ویسے تو ایک سو سے زیادہ ہے اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کا اس کتاب میں تذکرہ بھی ہو چکا ہے مگر بہ وجوہ بیتاب کی اپنی ایک انفرادیت رہی ہے۔ میرے خیال میں ان کے امتیاز کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گرچہ وہ شاد کے شاگردوں میں تھے مگر خود کسی استادِ سخن سے کم نہیں تھے۔ اس کا نمایاں ترین ثبوت یہ ہے کہ شاد نے زندگی کے آخری ایام میں خود اپنے چند ممتاز شاگردوں مثلاً سید شاہ خلیل الرحمٰن وفا، سید سعید الدین کیف اور سید معین الدین وغیرہ کو بیتاب سے اصلاح لینے کے لیے بھیج دیا تھا (بحوالہ تلامذہ شاد)۔ بلکہ یہ اپنے آپ میں وجہ امتیاز ہے کہ یگانہ جیسا شاعر نہ صرف ابتدا میں ان سے اصلاح لیتا ہے بلکہ اس کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ دوسری بڑی وجہ ان کی تعلیمی و تنظیمی صلاحیت ہے۔ شاد کے بعض دوسرے شاگردوں یا اس عہد کے کے عام شاعروں کی

طرح انھوں نے صرف مشرقی تعلیم نہیں حاصل کی تھی بلکہ انگریزی اسکول اور کالج کا بھی رخ کیا تھا۔ کچھ دنوں محمڈن اینگلو عربک اسکول میں درس و تدریس سے وابستہ رہے تھے۔ اور 1905 میں مختار کاری کا امتحان پاس کر کے تاعمر ایک ممتاز وکیل کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ شاد کی وفات کے بعد ان کے کلام کی اشاعت اور "انجمن تلامیذ الرحمٰن" کے تحت ان کے شاگردوں کی شیرازہ بندی میں مصروف رہے۔

دراصل داغ اور شاد جیسے معاصرین کی موجودگی میں اپنا کوئی مقام بنانا مشکل تھا مگر بیتاب نے یہ مشکل مرحلہ بخوبی سر کیا۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ مسدس، قطعات اور نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ گرچہ بقول محمود علی خاں صبا انھیں شہرت عام اس مشاعرے سے حاصل ہوئی جو نواب سید مہدی علی خاں عرف بادشاہ نواب عشرتی کے یہاں درج ذیل طرح میں منعقد ہوا تھا۔

نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے

ان کا زیادہ کلام محفوظ نہیں ہے مگر جو کچھ میسر ہے اس کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ابتدا میں داغ دہلوی سے متاثر رہے اور بعد میں شاد کی گہری معنویت ان پہ غالب رہی ہے۔ محمود علی خاں صبا نے ان کے بارے میں بڑی منصفانہ رائے دی ہے جس کا ایک حصہ یہاں نقل کرتا ہوں:

> "علمیت، صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے بیتاب ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے اور ان میں وہ سب اوصاف موجود تھے جو ادب و شعر میں ایک نئے طرز کے بانی ہونے کے لیے ضروری ہوں لیکن قدیم مسلک اور استاذ پرستی اس راہ میں سنگ گراں بن گئے جسے وہ ہٹا نہیں سکے۔ ماحول بھی ایک بڑی حد تک رکاوٹ پیدا کرتا رہا۔ اگر ان کا پس منظر اور ماحول مختلف ہوتا یا وہ ان سے بغاوت کرنے کی ہمت رکھتے تو وہ یقیناً ایک نئی طرز کے موجد ہو سکتے تھے۔"

میں موصوف کی طویل رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بیتاب غزل کی مہذب اور شائستہ روایتوں کے ایک اچھے نمائندہ اور امین تھے مگر عہد ساز نہ تھے اور شاد کے عہد میں ان کے کسی شاعر کا عہد ساز ہونا شاید ممکن بھی نہ تھا۔ بیتاب کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہزار ہا جو گریباں میں تار باقی ہے — جنوں بتا کہ یہ کیسی بہار باقی ہے
سبیلِ ساقیِ کوثر نثار ہے جاری — پکار ہے کہ کوئی بادہ خوار باقی ہے

اثر نہ پوچھیے ساقی کی مست آنکھوں کا
یہ دیکھیے کہ کوئی ہوشیار باقی ہے

فریب کھا نہ تجلّی طور کا اے دل
سنبھل سنبھل ابھی دیدار یار باقی ہے

ڈوب جانے کے سوا عشق میں چارہ ہی نہیں
اس سمندر کا کسی سمت کنارا ہی نہیں

سنتے آئے ہیں کہ اک روز قیامت ہوگی
آپ نے زلف پریشاں کو سنوارا ہی نہیں

پردۂ دل سے صدا یار کی آ ہی جاتی
ہم تذبذب میں رہے اس کو پکارا ہی نہیں

باز ہم ایسے تصور سے کہ اب تک جس نے
ایک نقشہ بھی ترا ٹھیک اتارا ہی نہیں

مل گئی ان کی نظر میری نظر سے آخر
اب تو دینا ہی پڑا دل کوئی چارہ ہی نہیں

محمود علی خاں صبا

سید محمود علی خاں (تخلص صبا) ولد نواب سید احمد علی خاں اپنے موروثی مکان 'کاشانۂ' واقع محلہ سنگی دالان، پٹنہ سیٹی میں 23/اگست 1907 (بمطابق 31/رجب 1325ھ) کو پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی محلے میں گذرا مگر عمر کے آخری حصے میں نواب بہادر روڈ، پٹنہ سیٹی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاد کے درجنوں شاگردوں میں صبا کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے شاد کو ایک دبستان کی حیثیت سے establish کرنے کی کوشش کی۔ 10/جولائی 1987 بروز جمعہ (بمطابق 13/ذیقعدہ 1407ھ) وفات پائی اور گلزار پانچ قبرستان میں دفن ہوئے۔ سید نعمت اللہ نے اپنی کتاب ''تلامذہ شاد'' (مطبوعہ کراچی، پاکستان جون 2004) میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

> ''.....1914 میں پٹنہ سیٹی اسکول، منگل تالاب کے ابتدائی درجے میں داخل ہوئے۔ 1923 میں میٹرک محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پٹنہ کالج، پٹنہ میں داخلہ لیا۔ 1924 میں پٹنہ کالج میں بزم ادب کی بنیاد ڈالی اور اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اسی بزم ادب کے تحت

شاد عظیم آبادی کی صدارت میں مشاعرہ بھی ہوا۔ 1929 میں جب پٹنہ میں بہاری اسٹوڈنٹس کانفرنس کا سالانہ جلسہ صلاح الدین خدا بخش کی صدارت میں ہوا تو جنرل سکریٹری کے فرائض آپ نے ادا کئے۔ 1930 میں بی۔اے کیا اور قانون کے سب لکچر مکمل کر لیے تھے کہ آزادی کی تحریک تیز ہوگئی اور آپ میدان سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ آپ مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ ..... 52-1951 میں بغرض زیارت اسلامیہ و مقامات مقدسہ، ایران، عراق، شام، لبنان اور مشرق اردن تشریف لے گئے اور پاکستان بھی تشریف لائے۔ آپ کو شعر و شاعری کا فطری شوق تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں 22/جون 1923 کو شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ باذوق اور خوش فکر شاعر تھے۔ کلام سلیس، صاف ستھرا، جوش جذبات اور کیف و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی صاحب طرز ہیں۔ آپ کی تصنیف میں ''تاجدار اقلیم سخن حضرت شاد عظیم آبادی کے نورتن'' میں شاد کے نو ایسے شاگردوں کا تذکرہ ہے جن کی حیثیت خود استاد کی ہے۔ آپ کا دیوان ''موج صبا'' 1954 میں عظیم آباد سے شائع ہوا۔ 1956 میں ''ریاض الانساب'' کی اشاعت ہوئی۔ 'سفر محمود' تاریخی مقامات کا تذکرہ اور سفرنامہ ہے۔ 'یاران میکدۂ عظیم آباد کے اہل ذوق کا تذکرہ ہے، 1957 میں شائع ہوا۔ 'سروش میکدۂ انتخاب کلام حمید عظیم آبادی 1975 میں شائع کیا۔ بادۂ عرفاں، شاد کا غیر مطبوعہ کلام 1956 میں شائع کیا۔ کچھ کتابوں کے مسودے ان کے صاحب زادوں کے پاس محفوظ ہیں۔ بہار بھاشا پریشد سے لائف ٹائم پنشن ملتی تھی۔''

اس تفصیلی بیان کی مزید وضاحت ضروری نہیں۔ صرف دو تین نکات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ صبا کے کچھ اہم تحقیقی مضامین رسالہ ''معاصر'' (پٹنہ) اور بہار اردو اکادمی کے ترجمان ''زبان و ادب'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں بہار کے مختلف سرکاری اداروں بشمول بہار اردو اکادمی سے انعامات بھی حاصل ہوئے تھے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے شاد کی شاگردی ضرور اختیار کی مگر نظم و نثر دونوں میں اپنا ایک امتیازی راستہ بھی تلاش کرتے رہے۔ سید نعمت اللہ نے ان کا نمونہ کلام بھی اپنی کتاب میں پیش کیا ہے مگر میری نگاہِ انتخاب پہلے اس مقالے پہ ٹھہرتی ہے جو انھوں نے شاد عظیم آبادی تقریبات 1979 کے موقع پر لکھا

تھا۔اس سے ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:

''شاد نے بھی تشبیب میں بہاریہ مضمون نظم کیے ہیں۔انھوں نے اس کے چہرے پہ وہ غازہ ملا کہ اس کا حسن دوبالا ہو گیا۔انھوں نے کربلا کے ریگستان کو عام مرثیہ نگاروں کی طرح خصوصاً میر عشقؔ کی طرح بوستان فارسی نہیں بنایا بلکہ اس کی سچی تصویر کشی کی،انھوں نے خاندانی تفاخر کا سہارا نہیں لیا بلکہ اپنے زور قلم،انداز فکر اور حسن بیان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔''

(مطبوعہ ماہنامہ زبان وادب شاد عظیم آبادی نمبر 1979)

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تحریر میں حسن بیان بھی ہے اور تنقیدی نگاہ بھی۔مگر اس طرح کی دوسری تحریروں کو یکجا کون کرے؟ بہر حال، چند اشعار بھی بطور نمونہ نقل کرتا ہوں ؎

کیا سوز دل کا حال کہیں باغباں سے ہم
جلتا چراغ لے کے چلے آشیاں سے ہم

اس زندگی میں کھاتے ہیں دھوکے ہی سے فریب
اپنی بہار سے کبھی اپنی خزاں سے ہم

کیا کہوں کتنا جوانی میں خودی کا جوش تھا
آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

کچھ نہ سمجھا کس طرح یہ راز دل افشا ہوا
عقل کی دیوانگی تھی یا جنوں کا ہوش تھا

مسلم عظیم آبادی

محمد مسلم (تخلص مسلم اور قلمی نام جائے پیدائش کی نسبت سے مسلم عظیم آبادی) ولد سید محمد یوشع کا سن پیدائش اکثر مورخین نے 1895 لکھا ہے مگر سید نعمت اللہ "تلامذہ شاذ" میں 1888 بتاتے ہیں اور یہی درست ہے چونکہ ان کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا تھا۔ ان کے پردادا مولانا عنایت علی تھے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے نائب مولوی ولایت علی کے سگے بھائی تھے۔ اس طرح مسلم کی ذہنی تشکیل میں اس عہد کے ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ وہابی تحریک اور علمائے صادق پور کے وہ اثرات بھی شامل رہے جو نسلاً بعد نسل اس خانوادے میں منتقل ہوتے رہے تھے۔ 8 برس کی عمر میں مسلم کی ماں نے اور 14 برس کی عمر میں والد نے وفات پائی جس کے بعد تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی خالہ اور خالو نے سنبھالی۔ پہلے مشرقی انداز میں عربی، فارسی اور حدیث وغیرہ کی تعلیم دلوائی، پھر انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ اس دوران 1908 میں ماموں زاد بہن سے مسلم کی شادی ہوگئی مگر حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ 1922 میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اور ایم۔او۔ایل کرنے کے بعد کچھ دنوں جامعہ ملیہ علی گڑھ کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں ملازمت کی۔ اس کے بعد محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں معلم مقرر ہوئے اور 1923 میں سینٹ

کولمبس کالج ہزاری باغ میں اردو اور فارسی کے استاد ہوئے جہاں سے 1955 میں سبک دوش ہونے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ وہیں 5 رفروری 1977 کو وفات پائی اور پاپوش نگر قبرستان کے جنوب مغربی کونے میں مدفون ہوئے۔

شاد کے تلامذہ میں مسلم عظیم آبادی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نظم ونثر کی طرف توجہ کی اور ان کے تحقیقی وتاریخی مقالے برصغیر ہندو پاک کے اہم رسالوں میں شائع ہوئے۔ شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی مگر خاص طور پہ ان کی غزلیں اور نظمیں ''نیرنگ خیال''، ''عالمگیر''، ''ساقی''، ''مخزن'' اور ''ندیم'' وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''رقص شرر'' کے نام سے کلیم الدین احمد نے مرتب کیا جو بہار اردو اکادمی سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی درج ذیل تصنیفات کا تذکرہ ''تلامذہ شاد'' میں موجود ہے:

1۔ تیسیر النحو: عربی نحو پر اردو میں کتاب مطبوعہ 1909

2۔ سلیقہ تحریر: اردو تحریر اور انشا پردازی پر کتاب مطبوعہ 1913

3۔ پارسی علوم اور اسلام: تحقیقی مقالہ مطبوعہ 1923

4۔ مبادیات دلسانیات ہند وایران: یہ کتاب (مطبوعہ 1926) ایک عرصے تک یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی۔

5۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی: مطبوعہ نومبر 1961۔ دراصل یہی وہ کتاب ہے جس کے سبب مسلم عظیم آبادی ایک عرصے تک سرخیوں میں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاد نے اپنی یہ سوانح حیات خود ہی لکھ کر مسلم عظیم آبادی کو شائع کرنے کے لیے دی تھی۔ مگر اپنے نام سے شائع کرنے کے بجائے مسلم نے اسے شاد کی طرف سے چھپوا دیا۔ اس سلسلے میں کئی ادبی مباحث کھڑے ہوئے جس میں شاد کے ورثا نے بھی حصہ لیا۔ بہر حال، شاد کی تفہیم میں یہ کتاب آج بھی معاون ہے۔

6۔ ذکر حبیب (سیرت نبویؐ) اس کتاب کا مقدمہ ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے۔

7۔ گلہائے رنگ رنگ (مجموعہ منظومات)

8۔ اشک وتبسم (مجموعہ منظومات متعلق شادی وغم)

9۔ دعوت فکر (افسانوں کا مجموعہ)

10۔ معتقدات عجم (اسلام پر عجمی عقائد کے اثرات کی تاریخ)

مسلم عظیم آبادی کی حیات، شخصیت اور خدمات کا تذکرہ تاریخ ادب اردو از وہاب اشرفی (جلد سوم)، بہار کے نظم نگار شعراء از قمر اعظم ہاشمی (شائع کردہ بہار اردو اکادمی)، شاد کے نورتن از محمود علی خاں صبا اور ''بہار کے نو چراغ'' از سید محمد حسنین وغیرہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار نقل کرتا ہوں:

ہم ہوں نہ ہوں، یہ دھن ہے کہ نام و نشاں رہے — یعنی ضیا رہے نہ رہے کچھ دھواں رہے

جس حال میں ہیں تیرے تصور میں مست ہیں — روح بہار ساتھ رہی ہم جہاں رہے

تم شکوہ سنج ہو غم غربت کے دوستو — ہم تو وطن میں رہ کے بھی بے خانماں رہے

مسلم قفس میں جو پلے لاچار کیا کرے — ہے نغمہ زن، بہار رہے یا خزاں رہے

محمودہ خاتون

بی بی محمودہ خاتون (تخلص محمودہ) بنت شاہ علی محی الدین یحییٰ واہلیہ سید شاہ محمد قائم چشتی نظامی قتیل داناپوری 17 رجب المرجب 1331ھ (بمطابق 1913) کو اپنے آبائی مکان واقع پھلواری شریف میں پیدا ہوئیں۔ سلسلہ نسب تاج العارفین شاہ محبوب اللہ قادری پھلواروی سے ملتا ہے۔ جناب شاہ عین الحق، سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کی صاحبزادی (زوجہ مولانا شاہ محمد ہارون) سے جو رشتے میں ان کی پھوپھی اور چچی ہوتی تھیں، قرآن شریف، حدیث اور تفسیر کے علاوہ خاندانی روایت کے مطابق عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی جس کے سبب کتب بینی سے خاص طور پہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ شعروسخن کا صاف ستھرا ذوق ورثے میں ملا تھا جسے قتیل داناپوری کی رفاقت نے جلا بخشی اور غزل کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی طرف توجہ کی۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "گلستان سخن محمودہ" کے تاریخی نام سے 1374ھ میں ان کے صاحبزادے پروفیسر طلحہ رضوی برق نے شائع کیا تھا۔ سید فصیح الدین بلخی کی کتاب تذکرۂ نسواں ہند مطبوعہ 1958 میں ان کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے:

"پھلواری شریف کی مخدوم زادیوں میں تھیں۔ شعر گوئی کا ذوق فطری تھا، جو کچھ کہتی تھیں حضرت قتیل کو دکھاتی تھیں۔" (135-134)

حکیم سید احمد اللہ ندوی نے اپنی مشہور کتاب "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" کی جلد 4 مطبوعہ 1968 میں ص 128 پر بلخی کی فراہم کردہ اطلاعات میں چند اضافوں کے ساتھ لکھا ہے:

" 4 ربیع الاول 1374ھ نو بجے دن کو داناپور میں انتقال کیا اور
پھلواری شریف میں حضرت تاج العارفین کے پائیں مزار مدفون ہوئیں۔"

غزل اور نعت کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ان کے طرز سخن اور فنی آراستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

سلسلہ کیوں عرش تک پہنچے نہ میری آہ کا
شبت لوح دل پہ میرے نقش ہے اللہ کا

پرتو توحید سے ہوا کا سماں ہے آنکھ میں
صفحۂ قلب حزیں ہے نقش اس درگاہ کا

محمودہ سچ تو یہ ہے کہ میرا کلام کیا
اک عکس ہے یہ فیضِ جناب قتیل کا

آنکھوں میں نور تیرا لب پر ہے نام تیرا
دل میں خیال شاہا ہر صبح و شام تیرا

عرش خدائے بر تر زیر قدوم اقدس
ادراک سے کہیں ہے بالا مقام تیرا

مختارالدین آرزو

مختارالدین احمد (تخلص آرزو) ابن مولانا ظفرالدین قادری کی پیدائش تقلیمی سند کے اعتبار سے 14 رنومبر 1924 بمطابق 16 ربیع... 1343ھ کو پٹنہ میں ہوئی۔ ابتدائی زندگی کے تین چار سال اپنی نانیہال استھانواں (موجودہ ضلع نالندہ) میں گزارے پھر یہ اپنی والدہ رابعہ خاتون کے ہمراہ پٹنہ چلے آئے جہاں 1943 تک مستقل طور پہ مقیم رہے۔ اس دوران آپ نے مدرسہ شمس الہدیٰ سے عالم و فاضل کی اسناد حاصل کیں اور مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جولائی 1943 میں وہ علی گڑھ گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ 1945 میں انٹر 1947 میں بی۔اے اور 1949 میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں لٹن لائبریری میں مخطوطات کی نظامت اور پی۔ایچ۔ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ تحریر کرنے میں مصروف رہے۔ جنوری 1953 کے بعد شعبۂ عربی علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے، اسی سال کے وسط میں امریکہ کی راک فیلر فاؤنڈیشن فیلوشپ مل گئی جس کے تحت ڈیڑھ برس کے قریب امریکہ اور مشرق وسطی میں رہ کر مختلف مخطوطات اور موضوعات پر کام کیا اور واپس علی گڑھ آ گئے۔ مئی 1968 میں شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر ہوئے۔ 1975 میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہوئے۔ 14 رنومبر 1984 کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے مگر یونیورسٹی نے آپ کی مجموعی خدمات

کے اعتراف میں مزید چار سال کے لیے ملازمت میں توسیع کی۔اپریل 1998 میں آپ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔جنوری 2010 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پروفیسر ایمرٹیس مقرر کیا مگر چند ہی مہینوں بعد 30/جون 2010 کو وہ راہی ملک عدم ہو گئے اور یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مختار الدین احمد کی ادبی خدمات کا کسی مختصر سے مضمون میں احاطہ کرنا محال ہے۔تحقیق و تدوین اور ادبی تاریخ نویسی کے میدان میں ان کی گوناگوں خدمات کا اعتراف ہند و پاک کے بیشتر محققین اور ادیبوں نے کیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ آپ نے اردو میں پہلا مضمون صرف بارہ سال کی عمر میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر (مئی 1936) میں لکھا تھا۔جو دہلی کے روزنامہ ''انصاری'' میں وسط 1936 کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد آپ نے تین سو سے زیادہ تحقیقی مقالات اردو میں لکھے۔اردو، فارسی اور عربی میں تقریباً بائیس تصنیفات ان کی یادگار ہیں جن میں سب سے اہم کارنامہ متفقہ طور پر ''کربل کتھا'' کی بازیافت اور تدوین کو مانا جاتا ہے۔ابتدا میں وہ پابندی کے ساتھ آرزو کے تخلص کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوتا گیا۔

پروفیسر مختار الدین آرزو آخری وقتوں تک بہار سے دلی لگاؤ رکھتے تھے جس کی ایک حد تک میں بھی شہادت دے سکتا ہوں مگر رضوان احمد نے اپنے مضمون مطبوعہ قومی تنظیم مورخہ 6/جولائی 2010 کی آخری سطروں میں ان کے جس درد کا تذکرہ کیا ہے اس کا مداوا اب کسی طرح ممکن نہیں۔پروفیسر وہاب اشرفی کی کتاب ''تاریخ ادب اردو جلد دوم'' ص 1012 (طبع اول) میں ان کی کتابوں کی ایک مختصر سی فہرست درج ہے۔''ہماری زبان'' کے شمارہ 15 تا 21/اگست 2010 میں ڈاکٹر عطا خورشید کا ایک اچھا مضمون ان کے احوال و آثار سے متعلق شائع ہوا ہے۔تفصیلی واقفیت اور مطالعہ کے لیے اور بھی مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔

معصوم شرفی اسیر

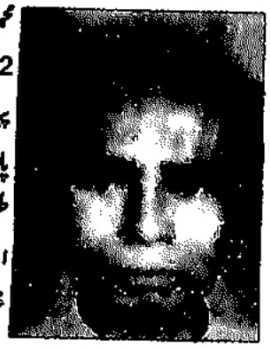

محمد ظہیر عالم (قلمی نام معصوم شرفی اسیر) ولد مولانا حافظ عبدالرحمٰن 12 دسمبر 1936 کو محلہ خانقاہ بہار شریف (ضلع نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ بہار اسٹیٹ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ سے عالم کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔یو۔ایم۔ایس کیا اور پٹنہ میں رہ کر یونانی طریقے سے مریضوں کا علاج کرنے لگے۔ پٹنہ کے مختلف اخبارات سے وابستہ رہے اور خود بھی اخبارات نکالے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ''داغ مسکراتے ہیں'' 1989 میں پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ گرچہ شاعری کا ایک بڑا سرمایہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

دراصل ان کی ادبی خدمات کا سب سے اہم پہلو وہ ہے جو اردو زبان کی مسلسل اور ہمہ وقت خدمت سے عبارت ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے لیے جس طرح لڑائیاں لڑی ہیں نیز ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر جد و جہد کرتے رہے ہیں، اس کے پیش نظر قائد اردو غلام سرور نے انھیں بجا طور پر اردو زبان و ادب کا بے لوث خادم قرار دیا ہے۔ یہ خراج تحسین ملاحظہ ہو:

''معصوم شرفی اسیر اس ملک کا وہ قابل فخر عام شہری ہے جس نے بغیر کسی معاوضہ و

غرض کے قوم کی، ملت کی، ملک کی، وطن کی، سماج کی، زبان کی، ادب کی، اور
انسانیت کی بے لوث دیانت دارانہ خدمت مسلسل تیس سال تک انجام دی"۔

معصوم شرقی اسیر نے بلا شبہ عوامی شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ کلاسیکی غزل کی روایت کو نعرۂ انقلاب سے کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ کر دینا آسان نہیں۔ اس اعتبار سے معصوم شرقی اسیر قابل توجہ ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

شعر کچھ غزل کے اب آپ کو دکھاتے ہیں
درد نے جو بخشا ہے داغ وہ دکھاتے ہیں

کھردری چٹانوں کے دل کو گدگداتے ہیں
ہم ہی جیسے دیوانے جوئے شیر لاتے ہیں

یہ جو کچھ اجالا ہے اس کے ہم ہی ضامن ہیں
ہم ہی کچھ چراغوں میں خون دل جلاتے ہیں

تمہارے دل میں بجز تیرگی کچھ اور نہیں
ہمارے دل میں کئی داغ مسکراتے ہیں

حرام مجھ پہ ہے ساقی کا جام رہنے دو
ہوں میکدے میں اگر تشنہ کام رہنے دو

غزل کے رمز و کنایہ سے آشنا ہوں میں
سری زباں کو زبان عوام رہنے دو

بہت بے چین رہتا ہوں یہ منظر مجھ کو کھلتا ہے
کسی کی آنکھ میں آنسو ہے کوئی ہاتھ ملتا ہے

عجب دنیا کے پہلو ہیں عجب نیرنگ عالم ہے
کوئی پھولوں پہ سوتا ہے کوئی کانٹوں پہ چلتا ہے

مرے ہی دم سے قائم ہے نظام میکدہ ساقی
ترے گھر کے چراغوں میں لہو میرا ہی جلتا ہے

مشتاق احمد نوری

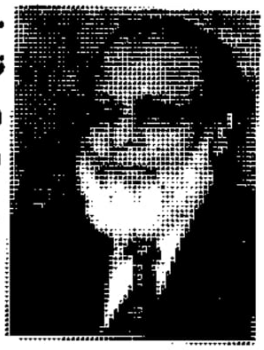

مشتاق احمد نوری ولد حفیظ الدین احمد تعلیمی سند کے اعتبار سے یکم فروری 1951 کو پیدا ہوئے۔ حقیقی تاریخی پیدائش) 7 رمئی 1950 اور آبائی گاؤں گوکی پوٹسیہ، فاربس گنج، ضلع اریہ ہے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی اور 1968 میں آزاد اکادی اریہ سے ہائر سکینڈری امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ 1971 میں پورنیہ کالج سے بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد مختصر وقفوں کے لیے کئی تعلیمی اداروں میں پڑھاتے رہے۔ 1975 میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی۔ 1976 میں ایم۔ایڈ میں داخلہ لیا اور اسی سال بہار پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا جس میں کامیابی کے بعد اگست 1977 میں بہار انفارمیشن سروس جوائن کر لی۔ دسمبر 1990 میں وزیر خوراک حکومت بہار کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے پٹنہ آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مارچ 1992 سے نومبر 1996 تک بہار اردو اکادی کے سکریٹری بھی رہے۔ آخر کار 2009 میں جوائنٹ ڈائرکٹر میں ترقی ہوئی اور اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے جنوری 2011 میں ریٹائر ہوئے۔ اس دوران جون 1980 میں بند پورہ گاؤں (مظفر پور) کے زمیندار ڈاکٹر اکرام احمد قادری کی دوسری صاحبزادی شائستہ انجم نوری سے شادی ہوئی جو اس وقت۔ بی۔اے کی طالبہ

تھیں اور اب ٹی-پی-ایس کالج میں اردو کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ چار بیٹے، ذی شان احمد نوری، حسان احمد نوری، شایان احمد نوری، اور عرفان احمد نوری ملازمت میں ہیں۔ ایک بیٹی زین فاطمہ زیر تعلیم ہے۔ فی الحال علی نگر کالونی پٹنہ میں رہائش پذیر ہیں۔

مشتاق احمد نوری کی ادبی خدمات خاصی متنوع رہی ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر، خاکہ نویس اور تنقید نگار بھی۔ انھوں نے بعض یادگار انٹرویو بھی لیے ہیں۔ نومبر 1967 میں ان کی پہلی کہانی '' دو روپ'' رسالہ دین دنیا، دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہندو پاک کے مختلف رسائل مثلاً آج کل، شاعر، شب خون، صبح نو، سب رس، ایوان اردو، ذہن جدید، جہان اردو، زبان وادب، افکار (کراچی) ادب لطیف (لاہور) روشنائی، اور آئندہ وغیرہ میں افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ دور درشن اور ریڈیو سے بھی کہانیاں نشر ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی انھوں نے کافی کہانیاں لکھی ہیں۔ '' لمبے قد کا بونا''، اعتبار، گہن چاند کا، کہیں ایسا تو نہیں، بند آنکھوں کا سفر، اور ''جن کی سواری'' ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ ان کی کچھ کہانیوں کا انگریزی پنجابی اور ہندی'' زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ انھوں نے اردو کے کم از کم ایک درجن ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں اور مختلف سمیناروں کے لیے تنقیدی مضامین بھی۔ خاص طور پر فکشن کی تنقید میں انھوں نے تجزیہ نگاری سے ملتا جلتا ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے جسے خاصی مقبولیت ملی ہے۔ بہار اردو اکادمی اور ساہتیہ سنسد سمستی پور سے انھیں ادبی انعامات حاصل ہوئے۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ بہار یونیورسٹی مظفر پور میں زیر تکمیل ہے۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے ''تلاش'' (1987) بند آنکھوں کا سفر (1996) اور چھت پر ٹھہری ہوئی دھوپ (2013) منظر عام پر آ چکے ہیں۔

نوری کے افسانوں میں حیات و کائنات کے آزادانہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی اور مثبت قدروں پر اعتماد کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ انھوں نے اسلوب کی سطح پر زیادہ تجربے نہیں کیے مگر روایتوں کو بھی اپنے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ایک بھرپور چاہت انھیں اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے کچھ الگ کرتی ہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی انھوں نے سرکاری رسالوں سے وابستگی کے باوجود اپنی پہچان بنائی ہے۔

منیر سیفی

سید امان اللہ ولد سید امیر الدین احمد قادری میٹرک سرٹی فکیٹ کے مطابق 12/ مارچ 1956 کو سہسرام میں پیدا ہوئے۔ خانقاہ کبیریہ سے تعلق رہا اور شعر و ادب کا ذوق وراثت میں ملا۔ گرچہ والد تجارت کرتے تھے مگر یہ مشق سخن کے لیے محترم سیف سہسرای کے شاگرد ہوئے اور اسی مناسبت سے منیر سیفی کا قلمی نام اختیار کرلیا۔ پیرو (بھوجپور) سے میٹرک اور ایس۔ پی۔ جین کالج سہسرام سے 1971 میں بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد 1974 سے بہار کے محکمہ پولیس میں ملازم ہوکر پٹنہ آ گئے۔ 1991 میں شادی ہوئی۔ صاحبزادے ذیشان زیر تعلیم ہیں اور خاندان مستقل طور پر سمن پور راجہ بازار میں مقیم ہے۔ منیر سیفی کی پہلی غزل ماہنامہ ''انیس ادب'' دہلی میں دسمبر 1967 میں شائع ہوئی تھی۔ یہی ان کی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے۔ ان کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

اجنبی صدا-1985

دعا کا شجر-1996۔ بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ

پھول خوشبو ہوا۔2010

انھوں نے غزل کے علاوہ نظم اور قطعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا

مجموعہ زیر اشاعت ہونے کی اطلاع ہے۔ انھیں 2001 میں ساہتیہ کار سنسد سمستی پور سے سردار جعفری راشٹریہ شکھر سمان اور چند برس قبل علی مجلس بہار سے ''بہزاد فاطمی ایوارڈ'' مل چکا ہے۔

منیر سیفی کی بیشتر غزلوں میں حزنیہ لب ولہجہ نمایاں ہے۔ اس کا ایک سبب بے گھری کا وہ غم بھی ہے جس نے انھیں اوائل عمر سے ہی بے چین رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے خاندان والوں نے ملک سے ہجرت کا فیصلہ کرلیا تھا اور آبائی مکان وغیرہ بھی فروخت کر دیا گیا تھا۔ مگر گھر کے کچھ بزرگوں نے ہجرت کی مخالفت کی اور حالت یہ ہوئی کہ تمام لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ شاید یہی بکھراؤ ان کی زندگی کا المیہ بن گیا جسے وہ مختلف استعاروں کے پردے میں بیان کرتے ہیں۔ ویسے ان کی غزلوں کا براہ راست اور خطابیہ رنگ وآہنگ کسی تشبیہ وترکیب کے بغیر بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ بڑی بات ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

میں یونہی ٹوٹتا بکھرتا ہوں — روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں
دشت و دریا غبار کرتا ہوں — میں ہوا ہوں کہاں ٹھہرتا ہوں
برگ گل تتلیاں سلامت سب — سر قلم خوشبوؤں کے کرتا ہوں

ضرورت بھر ضرورت چاہتا ہوں — پرندوں جیسی عادت چاہتا ہوں
گھٹن ہوتی ہے دہری شخصیت سے — دل آئینے کی صورت چاہتا ہوں
بہت کمزور بوڑھا آسماں ہے — کوئی مضبوط سی چھت چاہتا ہوں
فضا گھر کی مرے لائق نہیں ہے — سمندر دشت پربت چاہتا ہوں

مرا دل بھی معتہ ہوگیا ہے — بھری محفل میں تنہا ہوگیا ہے
بڑا آسان جینا ہوگیا ہے — گراں پھر لمحہ لمحہ ہوگیا ہے
مرا گھر منتظر ہے روشنی کا — زمانے میں سویرا ہوگیا ہے

منظر اعجاز

سید محمد منظر الحق (قلمی نام منظر اعجاز) ولد سید مقبول احمد تعلیمی سند کے اعتبار سے 12 دسمبر 1953 کو رسول پور، ترکی، ضلع ویشالی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کی۔ بہار یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو) ایم-اے (فارسی) اور پی-ایچ-ڈی- کرنے کے بعد مگدھ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کی۔ فی الحال اے-این-کالج، پٹنہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔

شاعری کا آغاز 1974 سے کیا اور چند دوستوں کے مشورے سے جن میں ظفر عدیم نمایاں ہیں، مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ ملازمت میں آنے کے بعد نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور ملک کے اہم رسائل و جرائد میں مضامین لکھتے رہے۔ اب تک ان کی درج ذیل تصانیف سامنے آچکی ہیں جن میں سے بیشتر ملک کی مختلف اردو اکادمیوں اور دیگر اداروں سے انعام یافتہ ہیں:۔

(i) اقبال اور قومی یکجہتی (مقالۂ تحقیقی برائے پی-ایچ-ڈی) 1994

(ii) اقبال عصری تناظر میں 2000

(iii) فیض احمد فیض اور صلیبیں مرے دریچے میں 2003

(vi) اعجاز نظر (تنقید) 2006

(v) قومی و وطنی شاعری کا منظر نامہ (تجزیاتی مطالعہ) 2006

(vi) ورق ورق اجالا 2009

(vii) ظفر عدیم ایک سخن ساز 2010

(viii) فراق اور غزل کا اسلوب (ترتیب) 2012

ان کے علاوہ ان کے مضامین اور شاعری کا ایک بڑا سرمایہ رسائل اور انتخابات میں محفوظ ہے جسے یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ موصوف ادبی صحافت کی طرف بھی متوجہ رہے ہیں اور رسالہ 'انعکاس' فراق نمبر کے حوالے سے ان کی خدمات قابل ذکر رہی ہیں۔

منظر اعجاز کی نگارشات پہ نظر ڈالتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ افلاطونی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ اپنے تنقیدی مضامین میں وہ خاصی تفصیل کے ساتھ موضوع کے مختلف نکات کو چھیڑتے ہیں اور بالآخر قاری کو ایک خاص نتیجے تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کی غزلوں پر ان کے مطالعے کا بھی اثر ہے اور اردو شاعری کی کلاسیکی روایات کا بھی۔ غور کیجیے تو ان کی شعری کائنات میں وہم و یقین، جبر و اختیار یا سکون اور بے قراری کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کا منظر نمایاں ہے۔ اسی سے فکر کے نئے دریچے بھی کھلتے ہیں اور آگے کی راہیں بھی متعین ہوتی ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر یہ غزل ملاحظہ ہو۔ حالانکہ ایک تیز گام شاعر ہونے کے سبب ان کے اشعار کا انتخاب دشوار کام ہے۔

یقیں کا رنگ بھی ہے وہم کا غبار بھی ہے
فریب حسن نظر وجہ اعتبار بھی ہے
خزاں کا رنگ بھی ہے معتبر چمن کے لیے
یہ حسن گل ہے جو سنت کش بہار بھی ہے
اسیر وہم و گماں ہے نہ جانے کب سے نگاہ
اگرچہ پیش نظر حرف اعتبار بھی ہے
یہ میں نے مانا سکوں موت کی علامت ہے
مگر سکوں کے لیے دل ہی بے قرار بھی ہے
عجیب طرفہ تماشا ہے اس کو کیا کہیے
کہ دل نگار بھی منظر وفا شعار بھی ہے
رکی رکی سی اگرچہ ہے کائنات کی نبض
بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کا انتشار بھی ہے

محمد ذاکر حسین

محمد ذاکر حسین ولد حافظ محمد محی الدین بونسی (ضلع مدھوبنی) میں تعلیمی سند کے مطابق 10 رفروری 1967 کو پیدا ہوئے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو عربی) اور بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے ام-اے (فارسی) کے امتحان پاس کیے۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی (فارسی) کیا۔ ندوۃ العلما سے عالمیت کی عربی سند لی اور مئی 1992 سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں جونیئر ریسرچ فیلو ہو گئے۔ 22 رجنوری 2001 سے اسی لائبریری میں لائبریری اور انفارمیشن اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

محمد ذاکر حسین کا شمار ایسی ادبی شخصیات میں کیا جانا چاہیے جو خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہ کر زبان و ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے علاوہ فارسی اور عربی ادب سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے جو ناقدین و محققین اور اہل علم کی توجہ کا مستحق ہے۔ ان کی پیش رفت بہر حال ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے جس کا اعتراف ڈاکٹر عابد رضا بیدار، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، ناوک حمزہ پوری اور ڈاکٹر ضیا الدین انصاری جیسے بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ امام بخش صہبائی سے متعلق ان کا کام بے حد اہم ہے۔

محمد ذاکر حسین کی تصنیفات وتالیفات کی ایک مختصر سی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ مخزن فوائد (اردو مخطوطہ کی تدوین) شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 1998 (بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ)

2۔ اختیار الرفیق لطلاب الطریق (عربی مخطوطہ کی تدوین) شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1998

3۔ خلاصہ انیس الطالبین (فارسی مخطوطہ کی تدوین) شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1996

4۔ دیوان اظہر علی اظہر کاکوروی (فارسی مخطوطہ کی تدوین) شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 2001

5۔ خدا بخش کے نادر عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست (3 جلدیں)، شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 1997

6۔ ملیشیا میں محفوظ اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی ایک دستی فہرست، شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 1996

7۔ ہمدرد میں محفوظ اردو رسائل واخبارات، شائع کردہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 1993

8۔ امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی، 2002

9۔ محاورات نجابت، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی، 2003 (بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ)

10۔ افکار ذاکر: مکاتیب کی روشنی میں، پٹنہ 2002

11۔ تلمیحات واشارات حافظ، عصمت پبلشنگ ہاؤس، مدھوبنی، 1997

12۔ 1857 اور امام بخش صہبائی (ہندی)، سنویہ، نئی دہلی، 2012

13۔ 1857 اور بہار کی پتر کاریتا (ہندی)، پربھات پرکاشن، دہلی، 2013

محمد مظاہر الحق

محمد مظاہر الحق ابن حاجی ظہور عالم رضوی انوار یکم دسمبر 1957 کو حویلی خانقاہ فریدیہ پھلواری شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ دادا سبحان احمد رئیس بہورہ ضلع سیوان اور نانا الحاج سید شاہ محمد نعمت اللہ فریدی، سجادہ نشیں خانقاہ فریدیہ پھلواری شریف نے ان کی ابتدائی تربیت اور ذہنی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ 1980 میں ایم۔اے اردو اور 1987 میں پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد کانتی اندر مہیلا کالج پٹنہ کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں اب تک درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ان کی اہم تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں:

1۔ خونی عاشق (ناول) 1987
2۔ شانِ بہار 1990
3۔ حکیم لطیف احمد اور ان کی تاریخ گوئی 1994
4۔ سیدہ اور ان کی تاریخ گوئی، 1997
5۔ اردو شاعری کا احتجاجی شعور 2004
6۔ مطالعات (خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا تجزیاتی مطالعہ) 2008
7۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا (2009)،
8۔ مقالات نو (2012)

محمد مظاہر الحق ایک خاموش طبع مگر فعال انسان ہیں۔ ویسے وہ کئی نثری اصناف سے وابستہ

رہے ہیں مگر انھیں تحقیق سے خاص لگاؤ ہے اور وہ نہایت انہماک کے ساتھ علمی و ادبی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ایک عرصے تک وہ انجمن ترقی اردو بہار کے سرگرم رکن رہے ہیں۔ ان دنوں نعمت اللہ ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے سکریٹری کی حیثیت سے مختلف فلاحی کاموں میں معروف رہتے ہیں۔ 1987 میں انھیں بہار اردو اکادمی کی جانب سے انعام مل چکا ہے۔

ان کی تنقید کے حوالے سے یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ وہ فن پاروں یا فنکاروں کا جائزہ لیتے ہوئے تاریخی تسلسل اور تشکیلی عوامل کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ کسی بھی موضوع کی فنی و فکری خوبیاں اور خامیاں واضح ہوتی ہیں بلکہ اس کی روایت بھی مختصراً ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

محمد کوثر اعظم

محمد کوثر اعظم ابن محمد یسین 18 رفروری 1962 کو موضع باتھ اصلی، ضلع سیتامڑھی بہار میں پیدا ہوئے اور 1986 سے مستقل طور پر پٹنہ میں مقیم رہ کر فیروز گاندھی کالج کرگہیہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تعلیمی لیاقت ایم۔اے (اردو) پی۔ایچ ڈی، بی ۔ایڈ ہے۔ انھیں بہار یونیورسٹی میں بہتر تعلیمی ریکارڈ کے لیے 1983 میں اسٹیٹ میرٹ اسکالرشپ ملی تھی۔ بہار اردو اکادمی سے بھی ان کی کتاب 'جوش کی منظری شاعری' پر انعام مل چکا ہے۔

محمد کوثر اعظم ایک محنتی اور ذہین مصنف ہیں جنھوں نے بہت کم عرصے میں بیک وقت کئی اصناف ادب میں اپنی پہچان قائم کی ہے۔ ان کے ظریفانہ مضامین میں ٹھہراؤ اور متانت ہے اور یہی دونوں خوبیاں ان کی تنقید میں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ 1996 میں ان کی دو کتابیں شگوفہ خیال (انشائیوں کا مجموعہ) اور جوش کی منظری شاعری (تنقید) زیور طبع سے آراستہ ہوکر اردو دنیا کو ان کے روشن مستقبل کی خبر دے چکی ہیں۔ مگر گذشتہ دس برسوں سے وہ خاموش ہیں۔ گرچہ ان کے تحقیقی مقالے ''اقبال کی شاعری میں منظر نگاری'' کے زیر اشاعت ہونے کی خبر آچکی ہے۔ اور مختلف ادبی سمناروں

میں ان کی شرکت برابران کی ادبی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا احساس کرارہی ہے۔

کوثر اعظم کسی خاص تنقیدی رویے یا ادبی نظریے کے پابند نہیں ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے مختلف ادبی تحریکات ورجحانات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو لائحہ عمل طے کیا ہے اس میں تدلیل تفہیم اور تجزیے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔گرچہ انھوں نے تقابلی مطالعوں سے بہت کم کام لیا ہے اوران کے بعض فیصلے قبول نہیں بھی کیے جاسکتے ہیں مگر مجموعی طور پر ان کے مضامین ایک بالغ نظر نقاد کے رویے کی خبر دیتے ہیں۔

نسیم مظفر پوری

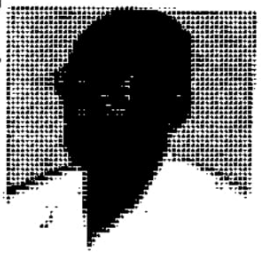

نسیم اختر (آبائی وطن کی مناسبت سے قلمی نام نسیم مظفر پوری) ولد عبدالکریم میٹرک کی سند کے اعتبار سے 5/جنوری 1943 کو پیدا ہوئے۔ قمر اعظم ہاشمی نے ''بہار کے نظم نگار شعرا'' میں تاریخ پیدائش 17/مارچ 1942 لکھی ہے جو غالباً اصل تاریخ ہے۔ نسیم نے بچپن محلہ چندوارہ مظفر پور میں گزارا اور عابدہ ہائی اسکول سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایل-ایس-کالج سے 1959 میں آئی-اے پاس کیا۔ 1961 میں بی-اے کا امتحان دینے کے بعد پٹنہ آ گئے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ برس حکومت ہند کے ادارے SISI میں کام کرتے رہے اور ۴/اگست 1963 سے ریزرو بینک آف انڈیا میں ملازم ہو گئے۔ وہیں سے بحیثیت اسسٹنٹ منیجر سبک دوش ہوئے۔ 1962 میں شادی ہوئی۔ چار لڑکوں اور تین لڑکیوں میں سے اکثر ماشاءاللہ خوشحال ہیں۔ ایک لڑکا ابھی زیر تعلیم ہے۔

نسیم مظفر پوری شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1956 میں ہوا۔ جب وہ اسکول میں دسویں درجے کے طالب علم تھے۔ 'بدحواسی' کے نام سے انھوں نے ایک افسانچہ لکھا جو انعام کے لیے پسند کیا گیا۔ پھر انھوں نے کئی انعامی مقابلوں میں حصہ لیا اور طالب علمی کا

دور ختم ہوجانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ 1994 میں انھیں 'ماحولیات' کے موضوع پر ایک خوب صورت نظم لکھنے کے لیے کل ہند مقابلے میں حکومت ہند کی طرف سے بھی انعام ملا۔ ویسے انھوں نے نثر نگاری میں ابن صفی کی تحریروں اور شاعری میں پروفیسر اختر قادری کی غزلوں سے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے مگر واقعہ یہ کہ انھوں نے باضابطہ طور پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ شاعری میں ان کا ایک مخصوص رنگ ہے جس میں صناعی اور توانائی کے ساتھ ساتھ عہد حاضر سے شناسائی کا بیک وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بے یقینی، شک، تذبذب، وسوسوں کے درمیاں
زندگی میں نے گزاری دشمنوں کے درمیاں
غیبت و دشنام کے نیزے چلیں گے دیر تک
گھر گیا ہوں آج پھر کچھ دوستوں کے درمیاں
پر کٹے ہیں، دل میں لیکن جرأت پرواز ہے
دیکھتا ہوں آسماں کی وسعتوں کے درمیاں
مرگئی ہیں آپ اپنی موت خود انجام کار
جنگ مدت تک چلی تھی خواہشوں کے درمیاں
گرچہ عاصی ہوں مگر میری دعا ہے اے خدا
میں رہوں ہر لحہ تیری رحمتوں کے درمیاں
رینگتی ہیں خوف کی پرچھائیاں ہر سو نسیم
شاہراہوں، بند کمروں، آنگنوں کے درمیاں

نسیم مظفر پوری نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں ''جسم کی آگ'' خاصی مقبول و مشہور رہی ہے۔ ان کی بعض نظموں کا انگریزی ترجمہ رام لال نے New generation میں شائع کیا تھا۔ ہندی اور بنگلہ میں بھی ان کی چند نظموں کا ترجمہ ہوا ہے۔ اب تک ان کی دو کتابیں، گرداب (شعری مجموعہ 1982 اور خوابوں کی کرچیاں (افسانوی مجموعہ 1985) کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کا قلم ابھی سرگرم کار ہے اور ان کے مزید شعری مجموعوں کا انتظار ہے۔

ولی کاکوی

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی (تاریخی نام: شاہ رضی) ولد سید شاہ غفور الرحمٰن احمد کاکوی، سید شاہد اقبال کے مطابق کاکو (ضلع جہان آباد) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کی۔ 1914 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی میں داخلہ لیا جہاں سے 1918 میں میٹرک اول درجے میں پاس کیا۔ نیو کالج (پٹنہ کالج) اور سینٹ کولمبس کالج ہزاری باغ میں تعلیم حاصل کی۔ 1923 میں امتیاز کے ساتھ بی-اے اور 1926 میں بی-ایل کی ڈگری لی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے فارسی کا امتحان پاس کرنے کے بعد جنوری 1927 سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر کام کرنے لگے۔ 1954 میں کمشنر پٹنہ ڈیویزن کے پی-اے ہوئے۔ 14 رمئی 1957 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے مگر ایک سال بعد اسی عہدے پر توسیع ملازمت ہوجانے کے سبب 1961 تک کام کرتے رہے۔ دوران تعلیم ہی ڈپٹی سید امانت حسین کی اکلوتی صاحبزادی سائرہ سے شادی ہوئی جس سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ پٹنہ میں ان کی رہائش فریزر روڈ پہ رہی۔ وہیں 13 رجون 1963 بمطابق 20 رمحرم 1383ھ وفات پائی اور باغ مجھی قبرستان پھلواری شریف میں دفن ہوئے۔

ولی کاکوی کے سوانحی حالات (مختصراً اور تفصیل سے) کئی کتابوں میں ملتے ہیں مگر محمود

علی خاں صبا نے اپنی کتاب ''شاد عظیم آبادی کے نورتن'' میں ان کی ایک خودنوشت سوانح شامل کی ہے جس میں ان کے احوال زندگی اور شاد سے شاگردی سے متعلق خاصی تفصیلات ملتی ہیں۔ یہ تعارف خاصا معلوماتی بھی ہے اور مستند بھی مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ ولی نے اپنی تاریخ ولادت 15 رجنوری 1902 لکھ دی ہے جو اعداد شمار کے اعتبار سے درست نہیں کہی جاسکتی ''چونکہ شاہ رضی'' تاریخی نام ہے جس سے 1316ھ برآمد ہوتا ہے اور 1316ھ سے 98-1897 کا عیسوی سال ہی ملتا ہے۔ ممکن ہے موصوف نے وہ تاریخ پیدائش لکھ دی ہو جو سرکاری ریکارڈ اور سرٹی فکیٹ میں درج ہو۔ بہرحال اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1916 میں ہوا اور 1918 سے وہ شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں شامل ہوگئے۔ سید نعمت اللہ نے اپنی کتاب ''تلامذہ شاد'' میں ان کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ نے جدید رنگ میں کامیابی سے اشعار کہے۔ آپ ایک خوشگوار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ کلام میں الفاظ کی بندش بہت خوب ہے اور اس میں روانی پائی جاتی ہے۔ آپ نے غزلیں، نظمیں، اور رباعی کی صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انگریزی نظموں کا نہایت خوب صورتی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ رباعیوں میں فلسفے، تصوف و اخلاقیات کے مضامین خوب صورتی سے باندھے ہیں۔ غزل میں شاد کے رنگ کے علاوہ اپنا ایک الگ رنگ نمایاں ہے۔ آپ غالب اور اقبال سے بھی متاثر نظر آتے ہیں... آپ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ آپ کے کلام کے علاوہ آپ کے تحریر کردہ تذکرے، تحقیقی اور تنقیدی مضامین برصغیر کے ممتاز جریدوں مثلاً نگار، معارف، جامعہ، ہمایوں، نقاد، عالمگیر، مخزن، ندیم، ساقی، نقوش، نوائے ادب، صدائے عام اور مہر نیمروز وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام تجلیات ولی کے نام سے 1983 میں اور تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ تنقید و ادب کے نام سے 1989 میں بہار اردو اکادمی پٹنہ کے تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ''برق و شفق'' کے نام سے کلام کا مجموعہ 1993 میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔''

واقف عظیم آبادی

سید شاہ فضل امام (واقف آروی ثم عظیم آبادی) ابن سید شاہ منظر امام کی پیدائش 18/مارچ 1916 کو جہان آباد کے موضع ارول (موجودہ ضلع ارول) کے سوہسا میں ہوئی۔ ان کی نانیہال آرہ میں تھی اور وہیں مدرسہ حنفیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ فیض الغربا سے عالم کی سند حاصل کی۔ 1967 میں اپنے ایک بیٹے اور پانچ بچیوں کے ساتھ مستقل طور پر پٹنہ آ گئے اور محلہ گولکپور میں سکونت اختیار کر لی۔ اس ہجرت کے اسباب تفصیلی تجزیے کا تقاضہ کرتے ہیں جن کا یہاں موقع نہیں۔ یہ شہادت نقل کر دینا کافی ہے کہ نانیہال اور دادیہال دونوں جانب سے ان کا خاندان کافی دولت مند تھا اور آرہ میں ان کا شمار باحیثیت لوگوں میں ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ساری جائداد ہاتھ سے نکلتی گئی اور بالآخر جب آرہ کا رہائشی مکان بھی فروخت ہو گیا تو انھیں پٹنہ کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں بھی ان کے حالات کچھ اچھے نہیں رہے۔ تلاشِ معاش میں کبھی کبھی میر کی طرح 'جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا' اور 'نالائقوں سے ملنے لیاقت مری گئی' جیسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک درویش صفت انسان کی صورت میں یہاں کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا حصہ بن گئے۔ ان کے صاحبزادے

سید اکبر امام کاشف نے جواب خود بھی پٹنہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، اس زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''روزنامہ سنگم، پٹنہ میں واقفیات اور واقف آرٹ کے عنوان سے منظوم کالم نگاری کرنے لگے۔ روزنامہ سنگم کے علاوہ ہفتہ وار ''ہمارا نعرہ'' (جس کے مدیر اعلیٰ شمس الہدیٰ استھانوی مرحوم تھے) اور ہفتہ وار عظیم آباد اکسپرس (جس کے مدیر اعلیٰ مشہور صحافی جناب رضوان احمد تھے) سے برسوں تک وابستہ رہے۔ ان کے سب سے زیادہ قریبی تعلقات روزنامہ سنگم کے مدیر اعلیٰ جناب غلام سرور مرحوم سے تھے۔ جناب غلام سرور مرحوم قوم وملت کے سوال پر جب جیل کے سفر پر ہوتے تھے اس دوران علامہ واقف عظیم کے کاندھوں پر ہی روزنامہ سنگم کی اشاعت کی ذمہ داری آجاتی تھی۔''

بہر حال اردو کے ایک صحافی اور خادم کو جن نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان سے واقف عظیم آبادی بھی عمر بھر دوچار رہے۔ اور بالآخر 7 ستمبر 1993 کو گولہ محلہ آرہ میں وفات پائی۔ وہیں بوعلی منزل سے ملحق مغربی جانب فصیل کے آخری گوشے پر مدفون ہوئے۔

واقف عظیم آبادی کی علمی وادبی صلاحیت، قلندرانہ صفات اور بعض دوسری خوبیوں کا ایک زمانہ قائل رہا ہے۔ مگر ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے ''علامہ واقف عظیم آبادی کی شخصیت کے منفی پہلو'' مقالہ مطبوعہ روزنامہ قومی تنظیم 18 مارچ 2012 میں انھیں جس طرح ایک صاحب کرامت بزرگ ثابت کرنا چاہا ہے اس سے کلی طور پر اتفاق کرنا مشکل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ادبی دنیا میں واقف صاحب کی شہرت کا خاص سبب وہ قطعات و رباعیات ہیں جن کی ''واقف آرٹ'' کے نام سے ایک عرصے تک مقامی روزناموں اور رسالوں میں اشاعت ہوتی رہی۔ Topical Issues پر اس قدر برجستگی اور روانی کے ساتھ تبصرہ کرنا کہ نشانہ بننے والا بھی مسکرا کر رہ جائے، آسان نہیں ہوتا۔ واقف کے بیشتر قطعات میں یہ خوبی موجود ہے گرچہ کہیں کہیں وہ حدِ اعتدال سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی دوسری اصناف پر بھی فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ نثری مضامین بھی لکھے ہیں اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ کی فرمائش پر بہار کی ادبی، سیاسی اور سماجی تاریخ بھی لکھی ہے جو تشنۂ اشاعت ہے۔ محمد ثاقب نے

علامہ واقف عظیم آبادی: حیات وخدمات'' کے موضوع پر 2006 میں ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی کی نگرانی میں بہار یونیورسٹی سے پی-ایچ ڈی کیا ہے مگر یہ مقالہ شاید اب تک شائع نہیں ہوا ہے اس لیے ان کے احوال وآثار پر مبنی ایک تفصیلی کتاب ان کے ادبی مقام کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ویسے تا حال ان کی درج ذیل تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔

1۔ مضامین واقف عظیم آبادی۔ (نثری مضامین) 2006

2۔ رازہائے درون پردہ (مجموعہ کلام) 2007

3۔ گلدستۂ نعت ومنقبت 2008

4۔ طنزیات واقف (واقف آرٹ کا انتخاب) 2011

واحد نظیر

عبدالواحد (قلمی نام واحد نظیر) ابن محمد بندھو بخش موضع نوادہ ضلع گریڈیہ میں تعلیمی سند کے مطابق 21/اپریل 1968 کو پیدا ہوئے۔ آبا واجداد کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا اور خاندان میں پڑھنے لکھنے کی حد تک تعلیم بس رسمی طور پہ دی جاتی رہی تھی۔ مگر ان کے والد نے (سال پیدائش 1918) جو بفضلہٖ تعالیٰ تادم تحریر بقید حیات ہیں نہ صرف خود دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کی بلکہ اپنے بال بچوں (پانچ بیٹے اور چھ بیٹیاں) کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ اور ان میں سے اکثر کو ملازمت کی طرف رجوع کیا۔ واحد نظیر نے جو گیارہ بھائی بہنوں میں سے سب سے چھوٹے ہیں، ابتدائی تعلیم ان ہی کی نگرانی میں حاصل کی۔ ایم۔ اے اردو فارسی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ایم۔ ایڈ کیا۔ ''عتیق اللہ کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی اور ایک عرصے سے پٹنہ میں رہ کر علم وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

واحد نظیر کی ادبی زندگی کا آغاز ویسے تو 1988 کے آس پاس ہوا۔ انھوں نے شاعری کی، مشاعروں کی نظامت کی، صحافت سے دلچسپی لی اور مضامین بھی لکھتے رہے۔ انھیں بنگال بہار حب الوطنی نظم مقابلہ کا پہلا انعام ملا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے ایسوسی ایٹ شپ اور خدا بخش

لائبریری کی جانب سے جونیر فیلوشپ ملی۔ مگر ان کا اہم ترین علمی و تحقیقی کام 2003 میں ''اسلحے، سکے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات: تحقیق و تجزیہ'' کے نام سے منظر عام پہ آیا۔ اس کتاب کی بجا طور پہ مختلف حلقوں میں پذیرائی ہوئی اور اسے بنگال اردو اکادمی کا انعام ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ تاریخ گوئی اور آثار قدیمہ میں واحد نظیر کی دلچسپی کا ثبوت ہے بلکہ بہار کے علمی و ادبی افق پر ایک نئے اور ذہین محقق کے طلوع ہونے کی بشارت بھی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے کس قدر عرق ریزی کے ساتھ پورا مواد فراہم کیا ہے اور پھر اسے تجزیے کے مراحل سے گذار کر اہم نتائج حاصل کیے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ واحد نظیر کی دیگر کتابوں کی فہرست جن میں سے بعض زیر طباعت ہیں، درج ذیل ہے:

1۔ تحقیقی و تنقیدی تدوین تذکرہ بدیع بیضا مع تحشیہ و تعلیقات (خدا بخش لائبریری)
2۔ بہار کی اردو مطبوعات کا وضاحتی اشاریہ (یو۔جی۔سی پراجکٹ کے تحت)
3۔ ''جہانِ نادیدہ'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین)۔ 2007
4۔ رونق اور کلام رونق۔ 2007

واحد نظیر کی ادبی شناخت بنیادی طور پہ ایک نوجوان محقق کی ہے مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے وہ شاعری سے بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ یہاں تک کہ بعض طرحی مشاعروں میں نعت پاک کے ساتھ بھی شریک ہوتے رہتے ہیں۔ کلام میں متانت احتجاجی تیور، توانائی نیز مذہبی اور اخلاقی پہلوؤں کی پیش کش نمایاں ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

شبیہہ گنبد خضرا ہے زیب چشم و جاں جب سے
مرے سینے میں رنگ و نور کا چشمہ ابلتا ہے

تری آمد پہ ظلمت نور میں بدلی تو حیرت کیا
تری خواہش پہ مولا بندوں کا کعبہ بدلتا ہے

زاویہ اپنا نظر اپنی ہے، تیور اپنا
کوئی منظر ہو بنا لیتا ہوں منظر اپنا

کس نے کشکول بدن میں یہ قیامت رکھ دی
عرصۂ حشر میں الجھا ہے مقدر اپنا

اور کیا کرتا خداؤں سے بھری دنیا میں
ذوقِ سجدہ کو سنبھالے رہا خود سر اپنا

بڑھ کے چومے ہے مرے پاؤں کے چھالے جب سے
فرض ہی بھول گیا راہ کا پتھر اپنا

دھندلے دھندلے ہیں نظیر اب کے مناظر سارے　　درمیاں دیدہ و دیدار کے ہے گھر اپنا

خود نما شخص کو وہ اچھی سزا دیتا ہے　　کچھ نہیں کہتا بس آئینہ دکھا دیتا ہے
جب کرم بندے پہ ہوتا ہے خدا کو مقصود　　سب سے پہلے اسے توفیقِ دعا دیتا ہے
کچھ کو وہ وسعت کونین عطا کرتا ہے　　کچھ کو وہ قد سے بھی کوتاہ ردا دیتا ہے
یہ جبیں غیر کی چوکھٹ پہ جھکے ناممکن　　باب ایماں پہ صدا قالو بلیٰ دیتا ہے
اب نظیر اس کو منا دے گی رعونت اس کی　　اب تو وہ حکم بہ انداز خدا دیتا ہے

واحد نظیر کو تاریخ گوئی سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے اور بہار کے نئے شاعروں میں وہ اس اعتبار سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

یہ چاند تارے بھی ہیں ہمارے

یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین (تاریخی نام افضل بیگ) ولد مرزا غلام حسین عرف مرزا پیارے صاحب مستند روایتوں کے اعتبار سے 2/ذی الحجہ 1301ھ (بمطابق 1884) اپنے آبائی مکان واقع محلہ چاہ باری کا گڑھا، مغل پورہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں حاصل کی انگریزی تعلیم کے لیے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے جو چند ہی سال پہلے قائم ہوا تھا۔ 1903 میں انھوں نے انٹر کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ 1904 میں کلکتہ گئے مگر وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی تو واپس پٹنہ آئے اور 1905 میں لکھنؤ جا کر اودھ اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ 1913 میں وہیں حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی کی لڑکی کنیز حسین سے شادی ہوگئی۔ اس کے بعد پٹنہ کی آبائی جائداد فروخت کر کے لکھنؤ میں ہی رہنے لگے۔ 4/فروری 1956 کو شاہ گنج لکھنؤ میں وفات ہوئی اور منشی فضل حسین خاں کی کربلا واقع وکٹوریہ اسٹریٹ میں مدفون ہوئے۔

مختلف کتابوں میں مرزا یگانہ کے حالات خاصے تفصیل سے لکھے گئے ہیں جن میں عظیم آباد میں ان کی رہائش، خاندانی حالات، رشتہ داریوں، ہجرت کے اسباب، لکھنؤ میں ان کی پریشانیوں اور

ادبی چشمکوں کے علاوہ سماجی سروکار وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان حالات کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بات بھی زیر بحث آئی ہے کہ مختلف وقتوں میں وہ یاس، یگانہ عظیم آبادی، یاس یگانہ یا یگانہ چنگیزی وغیرہ تخلص کیوں اختیار کرتے رہے۔ یہاں ان امور کی تکرار لا حاصل ہے۔ البتہ یہ بتا دینا برمحل ہوگا کہ لکھنؤ ہجرت سے قبل وہ پہلے شاد کے شاگرد بیتاب سے اور اس کے بعد خود شاد عظیم آبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ دوسری بات جو دوار کا داس شعلہ' قاضی عبدالودود' مختار الدین آرزو، بہزاد فاطمی، مالک رام اور حال فی الحال تلامذۂ شاد کے مصنف سید نعمت اللہ کے بیانات سے ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ہجرت کے باوجود عظیم آباد سے ان کا لگاؤ ہے۔ غالبًا وہ برابر یہاں آتے رہے۔ اور یہاں کے احباب یا حالات کی خیر خبر دریافت کرتے رہے۔ اگر چہ بعد میں یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ شاد کے انتقال کے چند برسوں بعد یہاں کی ادبی محفلیں بھی کچھ دنوں تک بے رونق ہونے لگی تھیں۔

یگانہ کے شاعرانہ امتیازات سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور ان سے متعلق کئی کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ میں بہر حال یہ محسوس کرتا ہوں کہ یگانہ ایک مخصوص انا پسندی کے سبب ہمیشہ عام روایت سے الگ ہو کر چلنا پسند کرتے ہیں۔ اس انا پسندی کا سلسلہ کبھی کبھی خود پسندی تک پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے عہد حاضر میں ان کے ایک اور ہم وطن حسن نعیم کی مثال پیش کی جا سکتی ہے مگر یگانہ کا حال یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر خود پسندی کے ایسے مواقع تلاش کرتے ہیں جن سے دوسروں کو ان پر حملہ آور ہونے کی دعوت ملتی ہے۔ حال کے دنوں میں ان کی شاعری سے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی کی یہ رائے مجھے خاصی معقول لگی:

> ''اپنی متاع بے بہا جو درد سوز اور آرزو مندی سے ہمکنار ہے اس کے مداوے میں وہ شانِ خداوندی سے بھی گریز کے لیے آمادہ ہیں۔ وہ ایسے خود شناس ہیں جو اپنے پیرہن میں مست الست ہیں۔ لہٰذا ان کے یہاں سجدہ گہہ ایاز میں بھی خودی پر ضرب نہیں پڑتی........وہ ایسے راہ رو ہیں جو اپنی منزل کی تلاش میں کسی خضر کی رہبری کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی راہ ان کی اپنی راہ ہے۔''

(آجکل-اپریل 2012 ص5)

یگانہ نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی، کامیابی کے ساتھ لکھی ہیں مگر ان میں غالب کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس فنی نقص کی طرف اکثر ناقدین نے اشارہ کیا ہے۔

یگانہ کی تصنیفات کی مختصر فہرست درج ذیل ہے۔ ان کتابوں کا تذکرہ مختلف مصنفین نے کیا ہے مگر سن اشاعت کی تفصیل عام طور سے نہیں ملتی۔

1۔ نشترِ یاس (مجموعہ کلام)

2۔ چراغِ سخن (عروض پر ایک رسالہ جس میں معاصر شعرا کی عروض دانی پر اعتراضات کیے گئے۔

3۔ شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز (عزیز لکھنوی پر شدید اعتراضات ہیں)

4۔ اندھی نگری (ہم عصر شعرا پر شدید اعتراضات)

5۔ آیاتِ وجدانی (مجموعۂ کلام غزلیات)

6۔ ترانہ (رباعیات کا مجموعہ-1935)

7۔ غالب شکن (1934)

8۔ ادبِ خبیث (ادبِ لطیف کے جواب میں لکھا گیا طویل مذمتی مضمون)

9۔ غالب شکن دو آتشہ (غالب شکن کا دوسرا ایڈیشن مع اضافہ)

نمونہ کلام درج ذیل ہے جس میں ان کے ذاتی نظریات وحیات کا عکس موجود ہے

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
ہمارا حوصلہ ہے اب ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا
کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا ہے
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہوکر

خودی کا نشہ چڑھا ہوش میں نہ رہا گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا دو زور کہ دنیا میں یادگار رہے

مناظر احسن گیلانی

سید مناظر حسن ولد حافظ سید ابوالخیر کی پیدائش استھاواں (موجودہ ضلع نالندہ) کے قریب چھوٹے سے گاؤں گیلانی میں یکم اکتوبر 1892 کو ہوئی۔ آبائی وطن کی مناسبت سے گیلانی کو اپنے قلمی نام کا جزو بنالیا۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجمیری تھے۔ ان کے والد حافظ قرآن پاک تھے۔ مگر عام طور پر زمینداری کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ اس لیے مناظر احسن کی ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے چچا حکیم ابونصر کی نگرانی میں ہوئی جو لاولد ہونے کے سبب انھیں اپنے بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں اچھی خاصی استعداد فراہم کرنے کے لیے انھیں 1906 میں ٹونک (راجستھان) بھیج دیا گیا جہاں ملک کے مشہور عالم دین اور ماہر تعلیم مولانا برکات احمد کے زیر سایہ مدرسہ خلیلیہ میں حصول علم کا موقع حاصل ہوا۔ ٹونک میں تقریباً سات برسوں تک اپنے زمانے کے اہم علما سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس بہار آئے اور حدیث کی پڑھائی کے لیے دیوبند چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں درس وتدریس بھی انجام دیے اور رسالہ ''قاسم'' کے مدیر بھی رہے۔ بعد کے دنوں میں دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر بھی رہے۔

1919 میں وہ حیدر آباد گئے اور 1920 سے جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) سے وابستہ

ہوئے تو صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے 1949 میں ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہی واپس اپنے گاؤں آئے۔ یہیں 5/جون 1956 کو (بمطابق 25/شوال 1375ھ) مختصر سی علالت کے بعد آپ کا انتقال ہوگیا اور آبائی قبرستان واقع گیلانی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ملک کے طول و عرض میں ان کی وفات پر تعزیتی جلسے ہوئے اور بیانات شائع ہوئے۔ عالموں اور ادیبوں کے علاوہ دیگر سماجی، سیاسی اور مذہبی طبقوں میں بھی اظہار افسوس کیا گیا۔ مختلف قطعات تاریخ وفات کہے گئے اور کئی قراردادیں پاس ہوئیں جن میں مولانا کے شایان شان ان کی یاد میں علمی و ادبی ادارے قائم کرنے کا اعلان ہوا۔ مگر بقول محمد ضیاالدین انصاری: ''افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا کی وفات کے بعد لوگوں نے انھیں بہت جلد فراموش کر دیا۔ اس عبقری، جامع الصفات، کثیر الابعاد اور ہمہ جہت شخصیت پر کوئی مبسوط سوانحی یا تحقیقی کام ایسا نہیں ہوا ہے جسے ہم اپنے وقت کے اس فرد فرید کے شایان شان کہہ سکیں'' (حرف آغاز-مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح) مطبوعہ 2002)۔

مولانا نے شعر و ادب، اسلامی تاریخ، فلسفہ، دینیات اور تعلیم کے موضوع پر کتابیں یا مضامین لکھے اور شاعری بھی کی مگر ایک عرصے تک ان کی خدمات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ بہر حال مولانا کے احوال و آثار خدا بخش لائبریری سے شائع شدہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی مذکورہ بالا مختصر سی کتاب کے علاوہ تاریخ ادب اردو از دہاب اشرفی، اردو ساہتیہ کے وکاس میں بہاری اور بھوجپوری کا یوگ دان (ہندی) مطبوعہ بہار راجیہ ابھی لیکھا گار پٹنہ 2012 اور ادب و تصوف سے متعلق بعض دیگر کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھی ان سے متعلق اچھا خاصا مواد موجود ہے مگر اس میں ایک دیوبندی عالم کی حیثیت سے ہی ان کا جائزہ لیا گیا ہے جب کہ ڈاکٹر سلمان شاہ جہاں پوری نے ان کی فراخ دلی اور وسعت مسلک پر زور دیا ہے۔ مولانا شمیم الدین منعمی بھی انھیں صوفیوں میں شمار کرتے ہیں۔

مجھے مولانا سے متعلق چند باتیں الگ سے عرض کرنی ہیں، چونکہ میں نے مولانا سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے لیے گیلانی کا سفر بھی اختیار کیا۔ اس سفر میں مولانا کے بھتیجے جناب جمال احسن گیلانی (فرزند مولانا مکارم احسن گیلانی) اور پروفیسر ابومنور گیلانی بھی میرے ہمراہ تھے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولانا کا لگایا ہوا آموں کا ایک خوبصورت باغ گاؤں میں ضرور موجود ہے مگر مولانا کا مزار شاہراہ عام سے قریب واقع ہے جہاں آم کا کوئی باغ نہیں جیسا کہ بعض مصنفین کا بیان ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی وفات سے متعلق جو کرامات مشہور ہیں، ان کی کوئی شہادت

مجھے نہیں ملی حالانکہ اب بھی مولانا کے براہ راست رشتہ داروں میں سے چند لوگ وہاں رہتے ہیں اور مولانا کے آبائی مکان سے متصل ایک دینی مدرسہ چلتا ہے مگر کسی نے ان واقعات کی شہادت نہیں دی جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام خطوط (مطبوعہ صدق جدید لکھنؤ۔23 رجون 1956) میں مذکور ہیں۔ میں ان واقعات کی صداقت سے براہ راست انکار نہیں کرنا چاہتا مگر ان کی تصدیق کے لیے بلکہ مولانا کے دیگر سوانحی حالات کے مطالعے کے لیے بھی تحقیق اور جستجو کا سلسلہ جاری رکھنے پر زور دیتا ہوں۔ کیا اسی پچاسی سال کی عمر کا کوئی ایسا بزرگ استھاواں، اوگاواں، پٹنہ، دیسنہ یا بہار شریف میں موجود نہیں رہا جو ان کرامات کی تصدیق یا تردید کر سکے؟ تیسری بات یہ ہے کہ مولانا کی تصویر کے سلسلے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی تصویر نہیں اتروائی یا ان کی کوئی تصویر موجود نہیں ہے مگر مجھے ان کے رشتہ داروں سے دو تصویریں عنایت ہو گئیں جن میں سے ایک سنگل فوٹو شریک اشاعت ہے۔ ایک آخری بات جس کی طرف ڈاکٹر ابوسلمان نے بھی توجہ دلائی ہے، ان کی تصنیفات کا تفصیلی مطالعہ ہے۔ یہ کام نوجوان محققین کے بس کا نہیں، اسے کوئی جینیوین اور ذہین عالم دین ہی کر سکتا ہے۔ میرے جیسے مبتدی بھی بہ یک نظر مطالعے کے بعد ان کی بیشتر علمی تصانیف کے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان میں عقیدے کی پختگی کے ساتھ ساتھ استدلال کی روشنی اور اسلوب کی دلکشی بھی موجود ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی ہمہ جہت اور Multidimensional علمی و ادبی شخصیت کی تفہیم کا حق اب تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔ ہند و پاک میں 'صدائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ولد سید ابوالحسن کی تاریخ پیدائش مختلف روایتوں کی بنیاد پر 12 دسمبر 1884 تسلیم کی جاسکتی ہے۔ آبائی وطن دسنہ (بہار شریف) تھا جہاں بڑے بھائی سید ابوحبیب اور سید مقصود علی سے گاؤں میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں مولانا شاہ محی الدین پھلواری اور مولانا عبدالرحمٰن سے حصول علم کیا۔ 1899 میں مدرسہ اسلامیہ دربھنگہ گئے۔ اور 1901 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں داخلہ لیا جہاں مشہور اسلامی اسکالر مولانا شبلی نعمانی کی زیر نگرانی تعلیم دی جارہی تھی۔ یہاں انھوں نے مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا حمید الدین اور مرزا ہادی رسوا سے بھی کچھ نہ کچھ فیض حاصل کیا۔ اور 1907 میں ندوہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عربی کے استاد اور رسالہ 'الندوہ' کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1913 میں مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' کی ادارت سے وابستہ ہوئے اور اسی سال دسمبر میں دکن کالج پونے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنائے گئے۔ مگر یہ ساری ذمہ داریاں عارضی نوعیت کی تھیں۔ 1914 میں اپنے استاد شبلی کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق 'دارالمصنفین' اعظم گڑھ سے وابستہ ہوئے تو تقریباً بتیس برسوں تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ اور اس ادارے کو انھوں نے عالمی سطح کا ایک بے مثال ادارہ بنادیا۔ 1946 سے 1950 تک وہ بھوپال کے محکمۂ تعلیم میں ڈائرکٹر کے عہدے پر

فائز رہے۔ اسی دوران 1949 میں حج کی سعادت حاصل کی۔ اور بعد میں پاکستان کے مختلف علمی و ادبی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو کر وہیں بس گئے۔ 22 نومبر 1953 کو کراچی میں انتقال ہوا اور اسلامیہ کالج کراچی کے احاطے میں آسودۂ خاک ہوئے۔

سید سلیمان ندوی ایک ایسے مورخ، عالم اور دانشور تھے جن کی مختلف النوع خدمات کا احاطہ کسی ایک مقالے میں تو کجا کتاب میں بھی کرنا محال ہے۔ ان کی تخلیقات 1902 سے ہی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ صفدر امام قادری کی اطلاع کے مطابق ان کا پہلا مضمون 'الپنچ' پٹنہ کے جون 1902 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اسی سال دسمبر میں ''مخزن'' لاہور میں ان کا مضمون ''آخر معشوق عرب کی یاد'' شائع ہوا۔ ''الپنچ'' میں ان کی بعض شعری تخلیقات بھی شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کے تحقیقی، علمی، مذہبی اور تنقیدی مقالے ملک کے معروف و مستند رسالوں میں شائع ہوتے رہے، جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ وہ ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شبلی کے نامکمل کاموں کو بھی مکمل کر کے شائع کیا جن میں ''سیرت النبی'' (دو جلد) سب سے اہم ہے۔ خود ان کی مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی درجنوں کتابیں خاصی مشہور رہی ہیں۔ جن میں ''عرب و ہند کے تعلقات'' (1930) کی شہرت بے مثال ہے۔ سید سلیمان ندوی بہار کی مردم خیز ریاست میں پیدا ہونے والے ایک ایسے عالم اور ادیب تھے جو اپنی زندگی میں ایک ادبی لیجینڈ بن چکے تھے۔ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ ایران عرب اور یورپ میں ان کی کتابیں زیر مطالعہ ہیں۔

انور عظیم

سید صدر الدین احمد (قلمی نام: انور عظیم) ولد سید بدر الدین احمد 15 دسمبر 1924 کو پوکسی (نوادہ) گیا میں پیدا ہوئے۔ ٹاؤن اسکول گیا سے میٹرک اور گیا کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز (نفسیات) اور ایم۔اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ کچھ دنوں تک پٹنہ میں جد وجہد کی۔ اس دوران ان کی پہلی شادی ہوئی جس سے ایک بچی بھی پیدا ہوئی مگر بقول وہاب اشرفی بہت جلد طلاق ہوگئی۔ ان کی دوسری شادی 54-1953 کے آس پاس خدیجہ سے ہوئی جس سے ایک بیٹا اور بیٹی نیلما ہے جو ٹی۔وی۔فلموں میں ایکٹرس ہے۔ انور عظیم کی وفات 20 جنوری 2000 کو ہوئی اور جامعہ نگر قبرستان، دہلی میں مدفون ہوئے۔ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کے سلسلے میں خاصہ اختلاف ہے۔ اردو دنیا نومبر 2013 کے شمارے میں ان کا وطن نوادہ لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ پروفیسر کاظمی ہری ہر پوری کے مقالے اور بھی کئی اختلافی آرا ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کلکتہ میں صحافی کی حیثیت سے کیا۔ بقول رضوان احمد انھیں پرویز شاہدی پٹنہ سے کلکتہ لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے 50-1948 کے دوران ''استقلال'' میں

کام کیا مگر مطمئن نہیں رہے۔ پھر وہ غلام ربانی تاباں کے ساتھ دہلی جا کر ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے اور مکتبہ جامعہ کے جریدے میں بھی 54-1952 کے دوران کام کرتے رہے۔ کچھ ہی برسوں بعد وہ ترقی پسند تحریک کے معماروں میں شمار ہونے لگے۔ پھر 67-1963 کے دوران اردو بلٹز کے ایڈیٹر رہے۔ 1955 میں وہ ماسکو بھیج دیے گئے جہاں انھوں نے روسی زبان سیکھی اور کلاس ون مترجم کی حیثیت سے چار سال کام کرتے رہے۔ ماسکو میں انھوں نے روسی ادب کے ساتھ ساتھ میوزک اور تھیٹر کا بھی جائزہ لیا اور مختلف روسی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ روس سے واپسی کے بعد وہ اردو بلٹز بمبئی کے مدیر ہوئے مگر تین برسوں بعد سوویت نیوز ایجنسی تاس، دہلی میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1969 میں انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف اداروں سے انعامات و اعزازات حاصل ہوتے رہے۔ 1999 میں انھیں دہلی اردو اکادمی سے تخلیقی نثر کے لیے انعام ملا اور 2000 میں غالب ایوارڈ برائے اردو ڈرامہ کے لیے ان کا انتخاب ہوا مگر یہ انعام حاصل کرنے سے قبل ہی برین ہیمبرج کا شکار ہو کر وہ راہی ملک عدم ہوئے۔

انور عظیم ایک ترقی پسند افسانہ نگار، ناول نگار، صحافی اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے خاصے معروف رہے ہیں۔ ان کی پہلی کہانی "چکراتے ہوئے۔ 1946 میں ماہنامہ "افکار" میں شائع ہوئی۔ اس پر کئی طرح کے ردعمل سامنے آئے مگر وہ نہ افسردہ ہوئے نہ انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ 52-1951 کے دوران ہند و پاک کے اہم رسالوں بشمول "فنون" نقوش، ادب لطیف اور "شاہراہ" جیسے رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہونے لگے۔ اس دوران انھوں نے کئی ناول بھی تحریر کیے۔ ان کے لکھے ہوئے کچھ ڈرامے بھی اسٹیج ہو کر بے حد مقبول ہوئے۔ دوردرشن کی پہلی ٹیلی فلم "فخرو میاں" کی اسکرپٹ بھی انھیں کی تیار کی ہوئی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انھوں نے ڈھائی سو افسانے، آدھ درجن ناول اور ایک درجن ڈرامے یا ٹیلی ڈرامے لکھے جو اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوئے۔ خود انھوں نے "سات منزلہ بھوت" کو اپنے ادبی سفر کا Turning Point قرار دیا ہے۔ ان کے ادبی مزاج اور رویے کی تفہیم میں ان کا یہ بیان معاون ہو سکتا ہے:

> "وہ ادب جو زندگی سے منہ چھپاتا ہے، بزدلوں کا ادب ہے۔ جو ادب زندگی کا سامنا کرتا ہے، جو زندگی کو جھیلتا ہے، وہ موت پر فتح یاب ہوتا ہے۔ میں زندگی کا لفظ

گہرے اور وسیع سماجی context میں استعمال کر رہا ہوں۔"

(انور عظیم نقش پا مطبوعہ ایوان اردو۔ دہلی، دسمبر 2000)

میں سمجھتا ہوں کہ ایک مارکسسٹ پس منظر سے وابستگی کے سبب وہ جاگیردارانہ تہذیب کے عروج و زوال یا اس کی شہ زوریوں اور کمزوریوں سے واقف تھے اور برائیوں کے خلاف احتجاج کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ ایوان اردو، دہلی، دسمبر 2000 میں ان کے احوال تفصیل سے مل سکتے ہیں۔ پھر بھی ان کی چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:-

"قصہ رات کا" (افسانہ) مکتبہ ملاقات۔ دہلی۔ 1972۔ "اجنبی فاصلے" (افسانہ) 1994۔ "دھان کٹنے کے بعد" (افسانہ) 1999۔ لابوہیم (افسانہ) 2000۔ جھلتے جنگل (ناول) 1998 رات کے راہی (ڈرامے)۔

رشیدۃ النسا

رشیدۃ النسا (عرف رشیدن بی بی) بنت خان بہادر شمس العلما سید وحیدالدین کی پیدائش 1853 میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کی تین شادیاں تھیں۔ پہلی بیوی سے چار بیٹے اور ایک بیٹی رشیدۃ النسا تھیں۔ جو رشتے میں امداد امام اثر کی سوتیلی بہن ہوئیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا سال پیدائش 1855 بھی لکھا ہے، مگر خود رشیدہ کا بیان ہے کہ وہ غدر کے ہنگامے میں چار برس کی تھیں اور میرے خیال سے اس بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ رشیدہ ایک روشن خیال اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ امداد امام اثر کے دونوں بیٹوں سر علی امام اور سر حسن امام نے وکالت میں بہت نام کمایا اور جدید بہار کے معماروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ رشیدہ کے والد بھی ایک اچھے عالم اور کھلے ذہن و دل کے مالک تھے۔ اس لیے رشیدۃ النسا نے ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں حاصل کی۔ اس کے بعد 1859 کے آس پاس شہر کے ایک اچھے وکیل محمد یحییٰ سے ان کی شادی ہوئی تو وہ شوہر کی حوصلہ افزائی کے سبب خود بھی آزادانہ مطالعہ کی راہ پر آگے بڑھنے لگیں اور پاس پڑوس کی بچیوں کو پڑھانے بھی لگیں۔ انھوں نے اپنے پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو بھی تعلیم دلائی، گرچہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم زیادہ تر غیر ضروری سمجھی جاتی تھی مگر ان کا بڑا بیٹا محمد سلیمان وکالت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا اور بڑی بیٹی نصیب النسا کی اولادوں میں ایک

نثار فاطمہ بھی ہوئیں جن کو بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کی ایک اور بیٹی کی شادی ڈمری (پٹنہ) کے میر علی کریم کے بیٹے میر رضا کریم سے ہوئی تھی جن کی بیٹی لیڈی انیس امام بہت دنوں تک راجیہ سبھا کی ممبر رہیں۔میر علی کریم نے 1857 کی جنگ آزادی میں بابو کنور سنگھ کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑائی کی تھی جس کے سبب ان کی بھی ساری زمینداری انگریزوں نے ضبط کر لی تھی۔

رشیدہ کا انتقال جولائی 1931 میں ہوا جب وہ تقریباً اٹھہتر برس کی تھیں۔ابھی ان کے قریبی رشتہ داروں میں عابد امام زیدی بقید حیات ہیں جو اچھے شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔

رشیدۃ النسا نے زیادہ نہیں لکھا۔لیکن ان کی ایک ہی تصنیف انھیں اردو کی ادبی تاریخ میں نمایاں مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں جنھوں نے 1881 میں عورتوں کی اصلاح اور توہم پرستی کی مخالفت کے لیے ایک ناول ''اصلاح النسا'' لکھا جو 1894 میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوا۔غور کیجئے تو اس ناول کی تصنیف اور اشاعت کی کہانی اس عہد کے احوال معاشرہ کی داستان ہے۔اپنے گھریلو حالات کی حوصلہ افزائی کے سبب انھوں نے ناول لکھ تو لیا مگر اسے شائع کرانے کی ہمت نہیں کر پائیں اور جب شائع بھی کیا تو اس میں اپنا تعارف اپنے بیٹے بیرسٹر محمد سلیمان: بھائی اور والد کے وسیلے سے پیش کیا۔ظاہر ہے کہ اس زمانے کا یہی ماحول تھا اور یہ بات بے حد معیوب سمجھی جاتی تھی کہ کوئی عورت مدرسے میں تعلیم حاصل کرے یا مذہبی کتابوں کے علاوہ اور کچھ پڑھے۔ایسے میں رشیدہ کا طرز عمل انقلابی نہ سہی بے حد جرأت مندانہ یقینی کہا جا سکتا ہے۔

یہاں اس ناول کی فنی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرنا ضروری نہیں۔یہ کام کئی لوگوں نے کیا ہے۔میں نے خود بھی اپنے مضامین میں ناول کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔یہ مضامین اردو کے علاوہ ہندی میں بھی شائع شدہ ہیں۔اس لیے انھیں امور کی دوبارہ تکرار بے معنی ہے۔ممکن ہے اس ناول کے علاوہ بھی ان کی بعض تحریریں موجود ہوں جن کی تلاش ہونی چاہیے۔فی الحال علم وادب کی ترقی کے لیے ان کی ایک اور کوشش کی طرف اشارہ کر کے بات ختم کرتا ہوں۔1906 میں انھوں نے ایک گرلس اسکول ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے قائم کیا جس کے معائنہ کے لیے بنگال کے گورنر کی اہلیہ لیڈی فریزر بہ نفس نفیس پٹنہ آئیں۔کئی برس بعد شہر کے ایک اور علم دوست رئیس بادشاہ نواب رضوی نے اس مدرسہ کی طرف دست تعاون بڑھایا تو یہ بی این آر ٹریننگ اسکول بن گیا۔آج یہ ایک گرلس کالج کی

شکل میں دعوت نگاہ ہے۔ جہاں اردو زبان وادب کی تعلیم کے لیے ایک مستقل شعبہ موجود ہے۔

4۔ اردو شاعری کی نئی جہتیں 2002

5۔ شعر العظیم (شعری مجموعہ) 2012

6۔ ورق العظیم (شعری مجموعہ) زیر طبع

7۔ خلافت اسلامیہ زیر طبع

کلام میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں

خوشبو لگے چمن لگے باد سحر لگے تو سر سے پاؤں تک مجھے خلدِ نظر لگے

عہد شباب تیرا نہ جائے کبھی صنم سولہ برس کی عمر میں تو عمر بھر لگے

دنیا ہے اور لوگوں کی نظروں میں خشک وتر میری نظر میں تو یہ جہاں خشک تر لگے

چند معاون کتب ورسائل

1۔	آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب/ ارتضی کریم، زلالہ پبلی کیشنز، دہلی،	1986
2۔	اردو ادب کی تاریخ /عظیم الحق جنیدی، علی گڑھ،	1990
3۔	بہار کے نظم نگار شعراء/قمر اعظم ہاشمی، بہار اردو اکادمی،	1979
4۔	بہار میں اردو تنقید/ اعجاز علی ارشد، پٹنہ،	1981
5۔	تاریخ ادب اردو جلد دوم (سوم)/ وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی،	2005
6۔	تذکرہ معاصرین جلد۴/ مالک رام، دہلی،	1982
7۔	تذکرہ ہند و شعرائے بہار/فصیح الدین بلخی، پٹنہ،	1962
8۔	تذکرہ مسلم شعرائے بہار (چھ جلدیں)/ سید احمد اللہ ندوی، کراچی،	1970
9۔	تلامذۂ شاد/ سید نعمت اللہ، ادارہ یادگار مولوی حسیب الدین مختار،	2004
10۔	دبستان عظیم آباد/ سلطان آزاد، نکھار پبلی کیشنز، مؤناتھ بھنجن،	1982
11۔	عندلیبان غزل (حصہ اول)/ظفر مجیبی، علمی مجلس، پٹنہ،	2009
12۔	شاد عظیم آبادی کے نورتن/ سید محمود علی خاں صبا، پٹنہ،	1987
13۔	رسالہ ندیم گیا ''بہار نمبر''	1940
14۔	اردو ساہتیہ کے وکاس میں بہاری وبھوتیوں کا یوگ دان (ہندی)، پٹنہ،	2012

یہ کتاب دبستان بہار کی تقریباً ایک سو اہم ادبی شخصیتوں کے احوال و آثار اور مختصر تنقیدی جائزوں پر محیط ہے۔ اس میں ان معروف ترین شاعروں اور نثر نگاروں کا بھی تذکرہ ہے جو آسمان ادب پر آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہوئے اور کچھ ایسی شخصیتوں کے بھی احوال ہیں جو بہترین ادبی صلاحیتوں کے باوجود گمنامی کا شکار ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں متعلقہ مواد کی فراہمی میں بے حد احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

کتاب کے مصنف پروفیسر اعجاز علی ارشد کا نام ایک ناقد اور انشا پرداز کے ساتھ ساتھ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کی حیثیت سے علمی و ادبی دنیا میں خاصا معتبر ہے۔ نثر و نظم دونوں میں ان کی خدمات کم و بیش دو درجن کتابوں پر مشتمل ہے۔ دعوت اور عداوت کرسی اور گرنسی، بہار میں اردو تنقید منثورات جمیل مظہری، اسلوب و معنی اردو شاعری کے چند زاویے اور اردو فکشن کے چند زاویے ان کی اہم کتابیں ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-183-8
9 789351 601838
NCPUL
New Delhi
₹ 150/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025